نمبر ۱۰۹
تذکرہ عام اردو

۸۵۸۶

حصہ پنجم

# علماء ہند کی شاندار ماضی

## تحریک دار العلوم دیوبند

از
محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ

ملنے کا پتہ شبلی بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ

## زیر سرپرستی

حضرت شیخ الہند مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

جو ہندوستان کے منتخب اور بلند پایہ علما کی قلمی امداد اور دلی ہمدردیوں کے ساتھ ہر مہینہ مرادآباد سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں علمی طبقہ میں رسوخ اور عام مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ **مقاصد رسالہ** (ا) سید الکونین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحابہ کرام۔ خلفاء راشدین) اور حضرات اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک اور مستند حالات پیش کرکے مسلمانوں کی مذہبی۔ سیاسی۔ اور اقتصادی یعنی مالی و تجارتی اصلاح (ب) حکومت، سیاست اور اقتصادیات کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و اشاعت اور ہندوستان میں حتی الامکان اس کے اجراء و نفاذ۔ نیز تحفظ ملت کے جذبات پیدا کرنا (ج) تاریخ عالم اور اقوام دنیا کے عروج و زوال کے فلسفہ اور وجوہات پر بحث کرکے مسلمانوں میں جذبات ترقی و عروج پیدا کرنا۔

**مستقل عنوانات**۔ مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب ذیل عنوانات رسالہ کے لئے معین کردے گئے ہیں۔ جن کے ماسوا بھرتی کے مضامین سے رسالہ محفوظ رہتا ہے۔

(۱) حکومت اسلامی کی توضیح و تفسیر (۲) سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۳) سیرت صحابہ کرام بالخصوص خلفاء راشدین و اصحاب صفہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) (۴) تعلیمات فرقان (۵) فقہیات (۶) فلسفہ ایمان (۷) سیاسیات و اقتصادیات مسلم (۷) نادر اور قلمی کتابوں کی اشاعت (۷) ادبیات (۹) رنات العرب یعنی تازہ بتازہ عربی اشعار و مضامین۔

اس کے علاوہ اصلاحی افسانے۔ جذبات آفریں نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ

(ترسیل زر کا پتہ)

(مولانا حکیم) **انظار احمد صاحب** مدیر انتظامی رسالہ قائد محلہ فیلخانہ مرادآباد

# حصہ پنجم

## تحریک

# دارالعلوم دیوبند

(دامت برکاتہا وعمّت)

## پہلا باب

### ۱۲۷۳ھ تا ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۷ء

مقصد دارالعلوم پر پوری طرح روشنی ڈالنے کے لئے موضوع سے کسیقدر ہٹ کر چند مقدمات بیان کرنے ضروری ہیں۔

## بنیادی وجوہات

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء تک

(۱) ہندوستانیوں کے دلوں میں مذہب کا احترام بہت زیادہ تھا۔

(۲) وطنیت کے احساس نے فرقہ وارانہ منافرت ختم کردی تھی۔

(۳) مذہب کی بدولت ارباب مذہب و علماء ملت کا احترام بہت کافی تھا

(۴) باہمی رواداری نے اقوام ہند کو ایک قوم بنا رکھا تھا۔
ان چاروں نمبروں کے لئے بہت زیادہ دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ہم گذشتہ
مختصر تحریر پر ہی قناعت کرتے ہوئے صرف نمبر ۴ کے لئے چند نقول پیش کرتے ہیں
(الف) کپتان[1] الگزنڈر ہملٹن سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ کے متعلق لکھتا ہے
یہاں ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں
تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح برتی جاتی ہے۔ وہ
اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں مناتے
تھے جب کہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن۔
ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مردے کے ساتھ ستی ہوں۔
آگے چلکر تحریر کرتا ہے صرف بنیوں کے ۸۵ فرقے ہیں اور گو کہ وہ ایک دوسرے
کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل جلکر رہتے ہیں، پارسی بھی ہیں اور
وہ اپنے رسوم مذہب زردہشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری۔

---

[1] کپتان الگزنڈر ہملٹن۔ سترھویں صدی میں ہندوستان آیا تھا جب یہاں ایسٹ انڈیا۔
کمپنی کی تجارت شروع ہوئی تھی اس زمانہ میں یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ
عقیدوں کے گروہوں کے درمیان اختلاف عقائد کی بنا پر کشت و خون اس حد تک
بڑھا ہوا تھا کہ سلطنت کے حکم سے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کے بچوں کو زندہ
جلا دینے تک کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ مگر ہندوستان کی حالت اس کے
نقیض تھی (تفصیل کیلئے حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۲۰)۔

اجازت ہے کہ وہ گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں۔ اون کے اخلاق عموماً شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

شہر سورت کی نسبت لکھتا ہے اس شہر میں تقریباً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے اون کے اعتقادات اور طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے مطابق اپنے معبود کی پرستش کرے[1]۔

سر جان مینارڈ جو کبھی پنجاب ایگزیکٹیو کونسل کا ممبر رہ چکا تھا۔ لندن کے ایک جریدے موسومہ "معاملات خارجیہ" میں رقمطراز ہے۔

ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے۔ جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت نہ قائم ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ برطانیہ سے پہلے بھی ظالم سلاطین گذر چکے ہیں جنھوں نے کبھی غیر مسلمین پر جزیہ لگایا اور کبھی گائے ذبح کرنے پر مجبور نا نہ جوش میں سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا اور خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش رہتے تھے[2]۔

---

[1] حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۱ - [2] ماخوذ از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۱ - ۱۲ -

مرجان بینارڈ کے قول کی تائید میں صدہا تاریخی واقعات پیش کئے جا-
سکتے ہیں جن میں سے ایک بطور نمونہ یہ ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی سے مرہٹوں
کی لڑائی ہوئی تو مرہٹوں کا توپ خانہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ توپ خانہ ایسی اہم
چیز ہے کہ اس پر لڑائی کا تمام تر دار و مدار ہوتا ہے۔ چنانچہ آج تک انگریزوں نے
اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی اور جب اوس لڑائی میں
احمد شاہ کے مقابلہ میں مرہٹے ہار گئے۔ اس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان
توپچیوں کو اون کی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی اور اون سے خواہش
کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آجائیں مسلمانوں نے جواب دیا کہ اون کے آقا ہاریں یا جیتیں وہ
اون کا ساتھ چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جاسکتے۔ اس سلسلہ میں ملک کے اندرونی نظام کا
اندازہ کرنے کے لئے گورنمنٹ کی رپورٹ پنجم ۱۸۱۲ء سے اقتباس کرنا نامناسب نہ ہوگا-
اس میں تحریر ہے۔

میونسپل (مقامی) گورنمنٹ کے اس سادہ نظام میں اہل ملک ایک نامعلوم
زمانہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہوگئی
جب تک اون کا گاؤں صحیح سالم ہے، اونھیں پرواہ نہیں کہ وہ کس سلطنت میں داخل ہوگیا-
یا کس بادشاہ کے قبضہ میں آگیا ہے ان کی اندرونی زندگی کے آئین اور دستور منقلب نہیں ہوتے

تاریخ ہند

ـــہ سردار توپخانہ کا نام ابراہیم خاں گردی تھا۔ اور اس موقعہ پر یہ بھی یاد رکھئے کہ سید صاحبؒ
کے توپخانہ کا دیانتدار خادم راجہ رام نام ایک راجپوت ہندو تھا جو جنگ اتمان زئی میں تمام رات
تنہا سید صاحب کی طرف سے سکھوں پر گولہ باری کرتا رہا۔ ملاحظہ ہو سوانح احمدی صفحہ ۱۱۱۔

ہندوستانیوں کی اسی وسیع الخیالی اور اپنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردانہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ لال یورپ ہندوستان میں آکر اطمینان سے رہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے واضح ہے کہ ہندوستانی کبھی قوم یا مذہب کے اختلاف کی بنا پر انگریزوں سے نہیں لڑے۔ جسطرح کہ آسٹریلیا اور امریکہ کے اعلیٰ درجہ کے مہذب لوگ کالے لوگوں کو اپنے ملک میں آباد ہونے سے روکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے کبھی اس طرح کسی کو نہیں روکا اور ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے تھے۔ لے

سر ہنری ایلیٹ جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کر کے اور تفرقہ انگیز فرضی افسانوں کا گندہ توکرا بنا کر ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا۔ اور جس کے تراجم اور اقتباسات اسکولوں میں داخل کرا کر ہندوستانیوں کی ذہنیت کو برباد کیا گیا۔ وہ دیباچہ میں لکھتا ہے۔ بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے احساسات، توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے۔ مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں اور اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔ صفحہ ۵۵ روشن مستقبل

مسلمانوں میں سیکڑوں ہندوانی رسومات اب تک جاری ہیں۔ پرانے ہندو مسلمان فقراء سے خاص عقیدت رکھتے تھے اون کے تعویذوں کو برکت جانتے تھے اور اپنے بچوں کو اسلامی مکتبوں میں تعلیم دلاتے تھے۔ بیاہ شادی کے موقعوں پر شرکت اور

---

لے حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲ و ۵۳۔

اور لین دین کی رسومات اجتک بہت سے علاقوں میں جاری ہیں۔ گاؤں کے بچے بڑوں کو چچا تاؤ کہتے تھے خواہ ہندو ہو یا مسلمان۔ اور بڑے بوڑھے ہندو مسلمان گاؤں کے چھوٹوں کو اولاد جانتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

## (۲) مغلیہ اور برطانوی حکومتوں کے نظریے

سابق اور موجودہ ہندوستان کا موازنہ کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اور گذشتہ حکومتوں کے نظریے پیش کئے جائیں۔

**سلطنت مغلیہ کے بانی** شاہ بابر کی وصیت ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں [۱]۔ مناسبت کے لحاظ سے اس موقعہ پر پھر نقل کرتے ہیں۔

شاہ بابر نے اپنے فرزند ارجمند ہمایوں کو وصیت کی تھی۔

اے پسر سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے۔ الحمد للہ اوس نے اوس کی بادشاہت تمھیں عطا فرمائی تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوح دل سے دھو ڈالو اور عدل و انصاف میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ سے مرہون ہوتی ہے جو قوم و ملت قوانین حکومت کی مطیع اور فرمانبردار ہے اوس کے مندر اور مزار برباد نہ کئے جائیں۔ عدل و انصاف

---

[۱] یہ وصیت جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجا رام کالج کولہاپور کے قلمی مسودہ سے نقل کر کے خلافت نمبر ۱۹۰۔ اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم و ستم کی نسبت احسان و لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ و سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جلکر کام کر رہے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور انہیں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ سرگذشت تیمور کو جو کہ اتفاق و اتحاد کا مالک تھا ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو۔ (خلافت نمبر ۱۹۔ اگست ۱۹۳۶ء)

**انگریزی حکومت** لیکن انگریزی حکومت کا نظریہ اس کے برعکس ہی تھا۔

ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر شعبہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات واسطے رکھتا ہو یا عدالتی اور مرکزی نظم و نسق سے یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" [۱]

"سر جان میلکم" نے کہا تھا۔

اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری ہیں جو بڑی جماعتیں ہیں اون کی تمام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اوس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھکر ہماری قوت کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔ [۲]

[۱] حکومت خود اختیاری صداہ۔ [۲] کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم از میجر باسو صفحہ ۱۸ بحوالہ روشن مستقبل ۹۴

مسز اینی بسنٹ لکھتی ہیں۔ کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی۔ بلکہ تاجروں کی جنگ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت و سازش، نفاق اور اعلیٰ درجہ کی دورخی پالیسی پر عمل کرکے۔ اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر ـــ اُسے یہ ملک حاصل ہوا۔[۱]

## (۳) تحفظ حکومت اور شہنشاہیت کے متعلق انگریزی پالیسی

احترام مذہب۔ احساس وطنیت ـ احترام علماء۔ اور باہمی رواداری جو ہندوستانیوں کے قدیمی امتیازات تھے مسلمان بادشاہوں کی طرح انگریزوں کے لئے بھی مضر نہ ہوتے۔ اگر انگریزوں کا مقصد ہندوستان میں حکومت کرنے سے ہندوستان کو لوٹنا اور امرا یورپ کی تجوریوں کو پر کرنا نہ ہوتا۔

لیکن بقول "برک" سابق فاتحین اور انگریزوں میں ایک فرق تھا۔ اور وہ یہ کہ سابق فاتحین کی خوشحالی اور بربادی اون کے نئے وطن ہندوستان کی خوشحالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہوجاتی تھی۔ اون کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ۔ کہ اوسی سرزمین میں اون کی اولاد پھلے پھولے گی۔ اسی طرح اون کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں زمانہ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ اون جیبوں کو جن سے دوبارہ

---

[۱] روشن مستقبل صفحہ ۱۳ - ۱۲

فائدہ اٹھاتا تھا اور سرنو بھر بھی دیتے تھے۔ لیکن انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا ہے۔ [1]

بہرحال یہ حقیقت اب اتنی روشن ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق دلائل پیش کرنا وجود آفتاب پر دلائل پیش کرنے کے مرادف ہے۔ اس لیے ہم اس بحث کو "داستان بربادی" کے حوالے کرتے ہوئے اپنے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ جب انگریز کا نظریہ ابتدا ہی سے یہ تھا کہ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ یورپ کے لئے حاصل کرے تو قدرتی طور سے ہندوستان کا مفاد اوسکے مفاد کے مخالف تھا۔

اوس کا فائدہ صرف اسی صورت میں تھا کہ ہندوستان بے کس اور بے حس مزدور کی حیثیت سے رہ پیہ کماتا رہے اور یورپ کے حوالہ کرتا رہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے لامحالہ انگریز کو صرف وہی صورتیں سوچنی اور عمل میں لانی تھیں جن سے (الف) احساس وطنیت ختم ہو۔

(ب) جن جماعتوں یا افراد کا عام ہندوستانیوں پر اقتدار ہے اوس کو اٹھایا جائے۔

(ج) جب کہ مذہبی جماعتوں کا عوام پر اقتدار تھا تو ضروری ہوا کہ یا تو اونکو اپنا ہم مذہب کیا جائے ورنہ کم از کم اپنے مذہب سے متنفر کر دیا جائے۔

(د) ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کئے جائیں جن کی بناپر

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۵۶

وہ بھوکے، ور تلاش ہو کر بھی انگریز کے وفادار رہیں

(۵) ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے اتنا خائف کر دیا جائے کہ وہ انگریز کے وجود ہی کو اپنی سلامتی تصور کریں۔

چونکہ ان تمام نظریوں کی تکمیل صرف تعلیم کے ذریعہ سے ہو سکتی تھی۔ لہٰذا تعلیم کا مسئلہ انگریزوں کی نظر میں سب سے اہم ہو گیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اوسکی توسیع و اشاعت کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ بلکہ پہلا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ اون کے فکر و تدبر کے سر چشموں کو قطعاً خشک کر دیا جائے تاکہ وہ جاہل بنکر ہر ایک پروپاگنڈے کا شکار ہو سکیں۔ اور اگر ضرورت پیش آئے تو صرف وہ تعلیم دی جائے جس سے وہ انگریز نما انگریز کے کٹر غلام اور اوس کے بے غیرت وفادار بن جائیں۔ لہٰذا آئندہ تحریر میں ہماری بحث کے موضوع تین قرار پائے ہیں

(۱) جاہل رکھنا (۲) عیسائی بنانا (۳) لامذہب بنانا۔

# تعلیم کے متعلق انگریزی پالیسی

## (۱)

## ہندوستانیوں کو جاہل رکھا جائے

(الف) غالباً سب سے پہلا نظریہ یہی تھا کہ ہندوستانیوں کو جاہل بنا دیا جائے لیکن اس سے پیشتر ہندوستان کی قدیم تعلیم کا اندازہ بھی ضرور ہونا چاہئے لڈلو نے تاریخ برطانوی ہند میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے ہر موضع میں

جو قدیم حالت پر قائم رہے۔ بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ حساب میں ان کو خاص مہارت ہوتی ہے۔ مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہو گیا ہے [1]

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو ۱۸۵۳ء سے انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا تھا ہندوؤں کے زمانہ میں ہر موضع میں ایک مدرسہ ہوتا تھا ہم نے چونکہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا تو اس سے ان کے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے اور ہم نے ان کی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی [2]

سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے [3]

"پروفیسر ماکس میلر" کے حوالہ سے مسٹر کیر ہارڈی نے لکھا ہے۔

انگریزی عملداری سے قبل (عہد عالمگیر؟) بنگال میں اسی ہزار دیسی ۸۰۰۰۰ مدرسے تھے۔ اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا [4]

کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے۔

"ٹھٹھہ" (سندھ) میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے [5]

سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا۔ قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن اور فراست کے اعتبار سے ہندوستان

---

[1] تاریخ باسو جلد پنجم صفحہ ۱۱۴ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۸ و تعلیمی ہند صفحہ ۲ [2] روشن مستقبل صفحہ ۱۲۸

[3] تاریخ فرشتہ بحوالہ تعلیمی ہند صفحہ ۳ [4] روشن مستقبل صفحہ ۱۲۷ [5] تعلیمی ہند صفحہ ۳

میں بڑی قوت رکھتے تھے۔ اون کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے تمام دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا۔ (مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۴ء)

اس سلسلہ میں "سر تھامس منرو" کا بیان زیادہ واضح ہے۔ آپ نے برطانوی قبضہ سے پیشتر ہندوستان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری مثل اون کی صنعت[1]۔ کاشتکاری کے معاملہ میں اون کی اعلیٰ استعداد ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جسمیں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد۔ اوس کی عزت و عصمت و عفت کا پورا پورا لحاظ۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستانیوں کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اوس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہونچے گا[1]۔

اس موقعہ پر یہ بھی خیال رکھنا مناسب ہے کہ کمپنی کے اون تمام مخالفانہ اور جابرانہ کارروائیوں کے باوجود جنکا کچھ تذکرہ آگے آتا ہے ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں

---

[1] تعلیمی ہند صفحہ ۱۲

کی تعلیمی اور ذہنی حالت جو کچھ باقی رہ گئی تھی اوس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے۔

عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو اون کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اوس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے [1]

پنجاب کے سررشتہ تعلیم کی رپورٹ سب سے اول ۵۶-۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی تھی اسوقت مسٹر آرنلڈ سررشتہ تعلیم کے افسر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا بحیثیت معلمی کے میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمانوں کے اسکولوں فارسی پڑھنے کے لئے بیشمار ہندو لڑکے اون پر اعتماد کرکے پڑھنے آتے ہیں۔

اوس کے بعد ۶۱-۱۸۶۰ء کی رپورٹ میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم لکھتا ہے مسلمان اُستاذوں کی بیشی جوان درسگاہوں میں ٹریننگ حاصل کررہے ہیں بالکل عیاں ہے ۳۳۳ مسلمان اُستاذ اور ایکسو گیارہ ہندو اور چھ دوسری ذاتوں کے ہیں [2]

(ب) گذشتہ نقول سے عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا کسی قدر اندازہ ہوگیا۔ لیکن جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء یعنی جہاد حریت سے ایک صدی پیشتر سے ہندوستان کی حکومت اوسی کمپنی کے قبضہ میں آنی شروع ہوگئی جو تجارت کرنے روپیہ بٹورنے کے لئے ہندوستان آئی تھی۔

کمپنی کے مالک بقول جسٹس سید محمود صاحب صرف یہ چاہتے تھے کہ تجارت اور

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۱۵۲۔ [2] روشن مستقبل صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۶۱

دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں اس لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہ سمجھتے تھے [1]

تجارتی لوٹ مار صنعت کی بربادی کاشتکاروں اور زمینداروں کی تباہی کے ساتھ اس کمینہ اور خود غرض حکومت (جو ایک ہی وقت میں سوداگر بھی تھی اور حاکم بھی) کی خود غرضی اور تعلیم سے قطعاً بے نیازی کا اثر یہ پڑا کہ جیسے جیسے کمپنی کی حکومت بڑھتی رہی علم و فضل کے بجائے جہالت پھیلتی رہی۔

چنانچہ ۱۸۲۴ء آنریبل۔ ایم۔ الفنسٹن اور آنریبل۔ ایف۔ وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس یہ ہے۔

انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دئے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع ہٹا دئے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے [2]

## سارے ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا جائے

سارے ہندوستان کو جاہل بنا دینے کا ایک نقصان خود اس عیار حکومت پر پڑتا تھا۔ یعنی حکومت کے چھوٹے چھوٹے کام ان کو . . . . . ہندوستانیوں ہی سے لینے تھے لہذا تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ مگر نظریہ یہ تھا کہ

[1] تاریخ التعلیم صفہ ۲ بحوالہ روشن مستقبل صفہ ۱۲۸ [2] روشن مستقبل صفہ ۱۳۳

رہی آنریبل مسٹر انفسٹن اور آنریبل۔ ایف وارڈن اپنی رسی یادداشت میں۔
جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں (اس الزام کے رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے)
تحریر فرماتے ہیں۔ میں علانیہ نہیں تو در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے
گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز
کیا جائے۔ تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک
اون کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اگر تعلیم سے اون کی رایوں میں ایسی تبدیلی
پیدا نہ ہوسکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم اس سے وہ زیادہ ایماندار اور
محنتی رعایا تو ضرور بن ہی جائیں گے۔ [۱]

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے قابل اعتراض طریقوں سے
اسکولوں میں مذہب عیسوی کی تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں
چارلس گرانٹ نے اپنی کتاب میں جو اشاعت تعلیم کے بارہ میں لکھی تھی صاف
تحریر کیا ہے کہ۔

اس میں کلام نہیں کہ سب سے اہم تعلیم جو ہندو ہماری زبان میں پا سکتے تھے
وہ ہمارے مذہب کی تعلیم تھی جو متعدد رسالہ جات میں آسان الفاظ میں درج ہے
اور جو مکمل طریقہ سے انجیل مقدس میں موجود ہے۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لئے اونکی

---

[۱] تاریخ التعلیم صفحہ ۱۷ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۹۵

سوسائٹی نہایت ذلیل ہے - ان خرابیوں کی اصلاح قوانین کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی - خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں - دراصل تمام خرابیوں کی جڑ اون کے مذہبی مراسم ہیں - جنکی درج اون کے قوانین میں موجود ہے اور اون کے جھوٹے ناپاک اور قابل مضحکہ مذہبی اصولوں میں مضمر ہے -

ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہونچائی جائے جو تاریکی میں ہیں - بالخصوص ہمارے ربانی مذہب کے خالص اور پاک اصول انھیں بتائے جائیں -

اس بارہ میں ہماری ذمہ داری اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہوتے ہیں اوسے دوسروں تک کیوں نہ پہونچائیں -

(تاریخ التعلیم مصنفہ جسٹس سید محمود صفحہ ۱۳)

مندرجہ بالا اصول کو پیش نظر رکھکر حکومت کی طرف سے انگریزی تعلیم کے لئے عیسائی مبلغین کی مالی اور مادی امداد کی گئی - صوبہ بنگال میں ۱۷۵۲ء میں دو پادریوں کا اضافہ اس غرض سے کیا گیا کہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم دیں -

اسی طرح ۱۸۱۲ء میں کورٹ آف ڈائرکٹران نے "مسٹر سوارٹز" مشنری کو اسکولوں کی امداد کے لئے مستقل سالانہ امداد دی - اور اسی قسم کے اور اسکولوں کی امداد کی منظوری دی [1]

بہرحال یہ ابتدائی رجحانات اور خیالات تھے - اس کے بعد اگرچہ ظاہری

---

[1] حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۵

ظاہری طور پر حکومت کی جانب سے بھی کوشش ہوتی رہی کہ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہ دی جائے۔ مگر واقعات کا اگر علم حاصل کرنا ہو تو سر سید مرحوم کی تصنیف "اسباب بغاوت ہند" کا مطالعہ کیا جائے۔ جس کے برخلاف انگریزوں کی جانب سے آج تک کوئی تردید نہیں کی گئی۔ سر سید کے مضمون کا اقتباس ہم پہلے درج کر آئے ہیں۔ اس بحث کی مناسبت ہمیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اوس مضمون کے اعادہ پر مجبور کر رہی ہے۔

سر سید تحریر کرتے ہیں۔

سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی البتہ خفیہ تدبیریں کر کے جسطرح عربی اور سنسکرت کو نابود کر دیا۔ اسیطرح ملک کو مفلس اور جاہل بنا کر اور اپنے مذہب کی کتابیں اور وعظ و تبلیغ کو پھیلا کر اور نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بیدین کر دے گی۔

۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ شمالی، مغربی اضلاع میں اور گورنمنٹ کے لیئے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسطرح سے مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ جیسے جیسے گورنمنٹ کی فتوحات زیادہ ہوتی تھیں ہندوستانیوں کو رنج ہوتا تھا کیونکہ اون کو یقین تھا کہ جب کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا۔ ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں کھلے بندوں مداخلت کرے گی۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو مقرر کیا۔ اون کو تنخواہ دیجاتی ہے۔ دیگر اخراجات اور تقسیم کتب کے لئے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ اور ہر طرح اون کے مددگار اور معاون ہیں حکام شہر اور افسران فوج ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے تھے۔ اپنی کوٹھیوں پر مذ[illegible]

پادریوں کا وعظ سنواتے رہتے ۔

غرضکہ اس بات نے یہانتک ترقی پکڑی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا ۔

تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال جواب مفت تقسیم کی جاتی تھیں ۔جن میں دوسرے مذہب کے بزرگوں پر اعتراضات اور رکیک حملے ہوتے تھے ۔ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھکر کہتے ہیں جسکا دل چاہے اور جسکو رغبت ہو وہاں جاکر سنے ۔ پادری صاحبان کا طریقہ اوس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ اور میلہ میں جاکر وعظ کہتے ۔ اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے کچھ نہ کہتا ۔ اور بعض اوقات چپراسیوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے مشنری اسکول بہت قائم کئے ۔ اون میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی بڑے بڑے حکام ان اسکولوں میں جاتے اور دوسروں کو اون میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے ۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا ۔ مذہبی سوالات کے جوابات اگر عیسائی مذہب کے مطابق دئے جاتے تو اون نوعمر بچوں کو انعامات ملتے ۔ لوگ مجبوراً اپنے بچوں کو اون اسکولوں میں داخل کراتے کیونکہ اون کی حد سے زیادہ مفلسی اور محتاجی نے اولاد کی تعلیم کے لئے ان اسکولوں کے علاوہ اور کوئی ذریعۂ تعلیم نہ رکھا تھا ۔جس کے بعد وہ بسر اوقات کی شکل نکال سکتے ۔

دیہاتی مکاتب نے یہ یقین اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا تھا کہ ان کا مقصد صرف عیسائی بنانا ہے ۔ انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹروں کو کالا پادری کہتے تھے ۔ یہ لوگ افسران بالا کو خوش کرنے کے لئے زبردستی بچوں کو ان مکاتب میں داخل کرتے دیہاتی لیکن

بچوں کے ماں باپ کو یقین ہوتا تھا کہ یہ سب عیسائی بنانے کا جال ہے۔

انھیں کالے پادریوں کے سرٹیفکٹ پر ملازمت مل سکتی تھی۔

اسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے۔ جن کے ناگوار طرز نے یقین دلادیا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کے لئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے۔

جیل خانوں میں ایک شخص کا پکایا ہوا کھانا کھانے کا قانون بنایا گیا۔

۱۸۵۵ء میں پادری۔ ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری ملازمین کے پاس خطوط بھیجے۔ جنکا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگی۔ اس لئے آپ کو بھی صرف ایک مذہب عیسائی میں داخل ہو جانا چاہیئے۔

ان خطوط کے آنے سے سب پر دہشت طاری ہوگئی۔ خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس چیز کے منتظر تھے آخر وہ آہی گئی اب سارے سرکاری ملازموں کو عیسائی بننا پڑے گا۔ سرکاری ملازم شرم کی وجہ سے اون کو چھپاتے پھرتے تھے کیونکہ اون کے دوست احباب اون کو طعن دیتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ سرکاری ملازموں کو ایکدن کرسٹان بننا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶ تا صفحہ ۲۳ و صفحہ ۵ صفحہ ۹ اسباب بغاوت ہند)

اس قسم کے جذبات کا سلسلہ جو ہندوستان کے ملازم انگریزوں اور عیسائیوں سے لیکر پارلیمنٹ تک قائم تھا۔ اُس کا اندازہ مسٹر میننگس ممبر پارلیمنٹ

کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں کی گئی اور جس نے آتش جہاد کے مشتعل کرنے میں خاص اثر کیا۔ مسٹر مینگلس نے کہا

خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھلایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت۔ انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے ہر شخص کو اپنی تمامتر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے۔ اور ہمیں کسیطرح تساہل نہ کرنا چاہئے

# ردِ عیسائیت کے متعلق علمار ملت کی خدمات

ردِ عیسائیت بظاہر ایک واعظانہ اور مناظرانہ چیز ہے۔ جسکو سیاست سے بظاہر کوئی تعلق نہیں۔

لیکن غور کرو جب حکومت عیسائی گر ہو۔ جسکا نقطۂ نظر ہی یہ ہو کہ سارا ہندوستان عیسائی مذہب اختیار کرے اوس کی تمنا دلوں کے پردوں سے نکلکر زبانوں تک آرہی ہو۔ اور بے آئین اور جابر حکومت کا فولادی پنجہ اوس کی امداد کر رہا ہو تو یہ ہی تبلیغی اور خالص مذہبی خدمت کسقدر سیاسی اور کتنی زیادہ سخت اور پھر آزما بن جاتی ہے۔ بلاشبہ ردعیسائیت کے سلسلہ میں ہر ایک مناظرہ، ہر ایک تبلیغ، ہر ایک تصنیف اغراض حکومت سے سراسر بغاوت تھی انتہا یہ کہ ۵۷ء کے بعد بھی علماء کرام کی ایک جماعت کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ انگریزوں کو نصاریٰ اور نصرانی کہتے تھے

اُسوقت اس گمراہ کن تحریک کے مقابلہ پر کون سینہ سپر ہوا۔ کس نے

عیسائیوں کا مقابلہ کیا، پادریوں کا تعاقب کیا، مناظروں سے اون کو لاجواب کیا اون کی تردید میں کتابیں لکھیں۔

یہی علماء ملت تھے جنکو انگریز اور انگریزی ایجنٹوں نے گالیاں سنائیں اور سناتے رہے۔ جنکو تنگ نظر۔ جاھل۔ مذہبی مجنون اور پاگل کہا گیا اور بدنام کیا گیا۔ کسقدر ستم ہے کہ وہ دجال پادری جو لوٹ کے روپے سو لاکھوں روپیہ سالانہ کی تنخواہ پاکر ہندوستانیوں کی دین اور دنیا خراب کریں۔ نہ صرف اون کی گردنوں کو بلکہ اون کے دلوں کو گورنمنٹ برطانیہ کی چوکھٹ پر جھکائیں اور ظاہر و باطن۔ عمل اور عقیدہ ہر ایک لحاظ سے ابدالاباد کے لئے اون کو غلام بنادیں وہ تو مقدس، خادمان خلق، پاکباز مجاہد۔ اور وہ علماء جو اون کے دام فریب میں آنے سے انکار کردیں اور اپنے بھائیوں کو اون کے مکر سے آگاہ کردیں۔ وہ مجنون، پاگل، تنگ نظر، جاہل۔

" بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست "

اس سے بڑھکر ستم اور ظلم ہے اون خودغرض ہندوستانیوں کا جو آج تک علماء کو مطعون کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی سے روک کر سیاست میں ہندوؤں سے پیچھے کردیا۔

بلاشبہ علماء ملت نے انگریزی اسکولوں سے بائیکاٹ کا حکم دیا۔ اور نہایت دلیری، خودداری اور پامردی سے انگریز کی منحوس اغراض کو فیل کیا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کیا آج اعتراض کرنے والے احباب کسی مسلمان گھرانے کے فرزند رہ سکتے تھے۔

مس میو کا ارشاد ہے

عیسائی مبلغوں کے طرزِ عمل سے مسلمان انگریزی تعلیم کو مذہب عیسوی کی تعلیم کے مرادف سمجھتے تھے اور بمقابلہ ہندوؤں کے وہ اپنے بچوں کو پادریوں کے زیر اثر رکھنے پر آمادہ نہ تھے اون کے غرور اور ان کی مذہبی خودداری کو اس سے اشتعال ہوتا تھا اس لئے وہ اس تحریک سے علیحدہ رہے۔ (مادر ہند صفحہ ۸۹ بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۶)

کیا اس سے زیادہ کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ مس میو جیسی متعصبہ تو اس بائیکاٹ کو خودداری اور قومی غرور سے تعبیر کرے۔ اور ہمارے خود رو لیڈر اس کو ہماری اور علماء کی کوتاہ اندیشی قرار دیں۔ افسوس!

چشم خود بیں کہ بہ کندہ باد ⁂ عیب نمائند بندش در نظر

**مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب**

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انگریزی دور میں وہ مسلمان جن کے عزم۔ تعلیم۔ صلاحیت۔ ذہنی استعداد۔ اور نظم و تنظیم کے سامنے ہندو طفل مکتب تھا وہ خود ہندوؤں کے سامنے طفل مکتب بن گئے مگر اوس کا اصلی سبب بقول سید طفیل احمد صاحب علیگ (مصنف حکومت خود اختیاری) یہ ہے"

انگریزوں کی ابتدائی عملداری میں سرکاری دفاتر فارسی زبان میں تھے اور معلوم ہوا ہے کہ شاہ عالم ثانی سے اور انگریزوں سے ۱۸۰۶ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ قرار پایا تھا کہ دفاتر کی زبان فارسی رہے گی۔

لیکن خاص اوسی زمانہ میں دوسری اسکیم بھی زیر عمل تھی۔ جس پر تقریباً بیس سال پیشتر سے بحث ہو رہی تھی۔

چنانچہ "مسٹر چارلس گرانٹ" ڈائرکٹر کمپنی نے سنہ ۱۷۹۲ء سے اجرائے تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا جو سنہ ۱۷۹۷ء میں جاکر ختم ہوا جس کے حسب ذیل اقتباسات حقیقت کو واضح کردیتے ہیں۔

(۱) یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اوس کے ذریعہ سے ہمارے فنون فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دے - یہ تعلیم خاموشی کے ساتھ تمام غلط باتوں کی بیخ کنی کردیگی۔

(۲) مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ سے ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔

(۳) ہندو ایسے کمزور دل ہیں کہ اون میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز امید نہیں۔

(۴) جسطرح مسلمانوں نے دفتری زبان انگریزی رکھی تھی اوسی طرح انگریزی جاری کرنے سے عدالتوں اور دفاتر کے کام میں آسانی ہوگی - اور ہندو اوسے خوشی سے حاصل کریں گے۔ کیونکہ اوس سے اون کی وقعت اور اہمیت بڑھیگی۔

مسٹر ولیم ہنٹر کا بیان ہے۔

اپنی عملداری کے اوائل پچھتر سال میں یعنی سنہ ۱۸۳۲ء تک ہم نے اپنے انتظامی -

---

ع اسی مضمون کا ایک فقرہ یہ ہے کہ "مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا"۔ ۱۲ صفحہ ۱۲۰ روشن مستقبل

لہ روشن مستقبل صفحہ ۱۳۰ و صفحہ ۱۳۱ - ۱۲

ع سارہ ورادتیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے اوسی دسابق، نظام تعلیم کو جاری رکھا۔ اس زمانہ میں ہم نے اپنا سررشتہ تعلیم قائم کر دیا تھا۔ اور جوں ہی اوس سے ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں کی ملازمت کے عام راستہ بند ہو گئے[۱]۔

پھر اس نسل کو تیار کرنے کے لئے ہندوؤں سے کام لیا گیا۔ حتیٰ کہ بقول سر ولیم ہنٹر۔"

اوس وقت لوئر بنگال کے گورنمنٹ اسکولوں کی زبان ہندوؤں کی زبان تھی اور ماسٹر ہندو تھے۔ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان بت پرستوں کی زبان میں تعلیم پانا گوارہ نہ کر سکتے تھے اور پھر اوس پر اضافہ یہ ہوا کہ بقول سر ولیم ہنٹر ہندو اُستاد اسقدر کمزور اور بزدل تھا کہ بچوں میں انتظام قائم نہ رکھ سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے کسی حیثیت کا مسلمان اپنے بچہ کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنا گوارہ نہ کرتا تھا[۲]۔

ان امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۶۲-۱۸۶۰ء تک بقول سر ولیم ہنٹر اوس زمانہ کے اسکولوں میں دس ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان طالب علم ہوتا تھا[۳]۔

لیکن حصول تعلیم کے اسقدر موانع کے باوجود بھی مسلمان انگریزی پڑھکر کچھ نہ کچھ ملازمت پانے کے مستحق بنجاتے تھے مگر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ بعض جگہ ملازمت پانے سے ممنوع کر دیا گیا اس بارہ میں سر ولیم۔

---

[۱] مسلمانوں کے رفلاس کا علاج منجانب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۳۴ء صفحہ ۷

[۲] ایضاً صفحہ ۸ [۳] ایضاً صفحہ ۸

ہنٹر نے کلکتہ کے ایک فارسی اخبار مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔

اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں اون پر سوائے ہندو کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے گا۔ صفحہ ۱۵۸۔

اس خبر کو درج کرکے ہنٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

مسلمان اب اسقدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی اہلیت بھی حاصل کرلیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کردیا جاتا ہے۔ اون کی بیکسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں صفحہ ۱۵۸

حکام کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول سر ولیم ہنٹر ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چھٹی رساں یا دفتری کے مسلمان کو کوئی نوکری مل سکے (مفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۴ء)

بہر کیف خاص خاص احتیاط کے ساتھ ہندوؤں کو بڑھاتے ہوئے۔ اور اون میں دفتری قابلیت پیدا کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس سے روکتے ہوئے سرکاری زبان کی تبدیلی صیغۂ ملازمت میں مسلمانوں کے تنزل کا سبب تھی۔ یہ الزام اگر عاید ہوتا ہے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعصب عہدیداروں پر نہ کہ علماء ملت پر جنکا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ خود دار، غیور، آزاد منش واقع ہوئے تھے جو اخیر تک مسلمانوں کی آزادی و برتری کے لئے قربانیاں پیش کرتے رہے۔

آخر میں ہم مس منو کے ایک بیان پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا۔ اور اوس کے پھل سے اب ہم متمتع ہو رہے ہیں یہ عدالتوں کی زبان کی انتہا ملی تھی جو ابتدا میں معمولی معلوم ہوتی تھی مگر اُس کی مثال ایسی تھی جیسے کسی تن آور درخت پر کلہاڑی لگائی جائے [1]

### ردّ عیسائیت کے متعلق علمار کی تبلیغی خدمات

بیشک ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید صاحب نے بھی ردِ عیسائیت کی طرف توجہ مبذول فرمائی جسکی نوعیت کے متعلق ہم انشاء اللہ آئندہ کچھ تحریر کریں گے۔ لیکن اوس وقت کہ ردِ عیسائیت کے متعلق لب کشائی کرنا اغراض حکومت کے مقابلہ پر علانیہ بغاوت تھی۔ یہی علماء ملت تھے جو میدان میں آئے اور جس قوت سے مقابلہ کیا اوس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہوتا ہے [2]

ہندوستان میں اسلامی شوکت و سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شاہان مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ مرحوم زوال سلطنت کا پر حسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس پر خطر زمانہ میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ایک فاضل مسیحی پادری "فنڈر" عوام الناس کے سامنے دین عیسوی کی خوبیوں اور بزعم خود اسلام کی کمزوریوں پر تقریر کیا کرتا تھا پادری فنڈر تنہا نہ تھا بلکہ لندن سے اوس کے ساتھ مسیحی مبلغین

---

[1] مادر ہند حصہ صفحہ ۲۸۹ بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۷ [2] یہ واقعہ مدرسہ صولتیہ مکہ کی رپورٹ بابت سال عام ۱۳۵۷ھ سے نقل کیا گیا ہے مولانا محمد سلیم صاحب نائب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے شائع فرمائی

اور پادریوں کی ایک کافی جماعت تھی۔ جو اس امر کا بیڑا اٹھا کر ہندستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت یہاں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو۔ اور مسیحیوں کے غلبہ اور اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی بھی ہندوستان کی نرم اور اثر پذیر زمین میں جڑیں پھیلا دے۔

مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کیرانوی جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد سے تھے اور اس وقت خاندان ولی اللٰہی کے سلسلہ میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پادری "فنڈر" کے مقابلہ کے لئے مامور فرمائے گئے۔

مولانا موصوف نے پادری فنڈر سے خط و کتابت کر کے اسکی علمی قابلیت کا اندازہ کیا۔ اور پھر اوسکو مناظرہ کا چیلنج دیدیا معزز ہندو مسلمان اور انگریز اس مناظرہ کے حکم اور تاریخ قرار دئے گئے

چنانچہ تمام ابتدائی مراحل طے ہو جانے کے بعد اکبرآباد "آگرہ" میں مناظرہ قرار پایا۔ جو ماہ رجب ۱۲۷۰ھ میں یعنی ۱۸۵۷ء سے تقریبًا چار برس پیشتر اسلام و عیسائیت کی صداقت کے درمیان فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں ان دونوں کے تصادم کا پہلا واقعہ اور عظیم الشان مناظرہ تھا۔

مولانا محمد رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے غیبی امداد
اور تائید الٰہی کے ساتھ اپنی خداداد قابلیت اور تبحر علمی سے تین
روز کے متواتر جلسوں میں اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل
جسپر آج عیسائیوں اور پادریوں کو ناز ہے تحریف شدہ ہے
فاضل مسیحی سے اس عام جلسہ میں بجز تسلیم کے نہ بن پڑا۔ اس
لاجواب مسئلہ میں لاجواب ہو جانے پر پادری فنڈر اوسی
روز شب کی تاریکی میں ایسا چھپا کہ آگرہ بلکہ ہندوستان میں
پھر نہ نظر آیا۔ چوتھے روز حسب عادت جلسہ منعقد ہوا حکم اور
شرکاء جلسہ سب جمع ہوئے مگر فاضل مسیحی غائب تھا اُسوقت
یہ راز طشت از بام ہوا کہ سیاہی شب نے لارڈ بشب کی پردہ
داری کی۔ مجبوراً ان ججوں کو جو طرفین کی طرف سے حکم قرار پائے
تھے عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت کو اوسی زمانہ میں ایک غیور مسلمان نے آگرہ میں
چھپوا دیا تھا، پادریوں نے اس مطبوعہ رسالہ کو خاص اہتمام سے خرید کر ضائع کرنے
کی کوشش کی۔ مگر پھر بھی ہندوستان کے بعض علمی گھرانوں، ور قدیم کتب خانوں میں
اس عدیم المثال مناظرہ کا مطبوعہ رسالہ محفوظ ہوگا۔ حضرت مولانا مرحوم نے اس
مناظرہ کے بعد اس فتنہ کے بالکلیہ استیصال اور روک تھام کی غرض سے جو کتابیں
رد نصاریٰ میں تصنیف و تالیف فرمائیں۔ اون کی فہرست حسب ذیل ہے۔
(۱) اظہار حق۔ خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں کی خواہش اور

اور خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد آگرہ میں مناظرہ کی۔ تفصیلی کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط و تشریح کے ساتھ بیان ہے۔ قسطنطنیہ میں لکھی جو سب سے پہلے قسطنطنیہ چھپی۔ صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے عربی سے ترکی میں ترجمہ کیا اور ابراز الحق کے نام سے مکمل ترکی ترجمہ شائع ہوا۔ نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کئے گئے۔ بڑے پادریوں نے خاص اہتمام اور کوششوں سے تلف کیا۔ مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے مولوی سلیم اللہ صاحب مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد صاحب بہاولپوری ، راندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے گجراتی میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ جزاہ اللہ خیرا۔

۱۹۱۰ء میں انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا۔ جس کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اسپر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی ضلع علیگڑھ نے مکہ معظمہ میں مولانا مرحوم کو ٹائمز کا یہ تراشہ اور اظہار الحق کے متعلق اور مکاتب کو ہر بار اردو۔ یہ خاص اہتمام سے دیا تھا۔

(۲) ازالۃ الاوہام۔ ۱۲۶۹ھ میں ۵۰۴ صفحات اور بڑی تقطیع پر دہلی میں طبع ہوئی۔

(۳) ازالۃ الشکوک ۱۲۶۹ھ میں مولانا مرحوم نے تصنیف فرمائی۔ دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۴) اعجاز عیسوی۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم نے کامل طور پر بائبل کا غیر معتبر

کا محرف ہونا ثابت کیا ہے۔ پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں شائع ہوئی

(۵) اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث = دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے تثلیث کو باطل کیا ہے۔ مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی۔

(۶) بروق لامعہ = رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر ختم نبوت کا مدلل اثبات (غیر مطبوعہ)

(۷) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف = ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی۔ تحریف الانجیل پر محققانہ بحث ہے (مطبوعہ قمر المطابع دہلی)

(۸) معدل اعوجاج المیزان = یہ کتاب میزان الحق۔ مؤلفہ پادری فنڈر کا جواب ہے نایاب ہے۔

(۹) تقلیب المطاعن = یہ کتاب "تحقیق دین حق" مصنفہ پادری "لاسمنار" کا رد اور جواب ہے۔

(۱۰) معیار التحقیق - کتاب "تحقیق الایمان" مصنفہ پادری صفدر علی کا دندان شکن جواب ہے۔

## ہندوستانیوں کو لامذہب بنایا جائے

تعلیم کے متعلق مذکورہ بالا دو پالیسیاں وہ تھیں جن پر یکے بعد دیگرے عمل ہوتا رہا۔ مگر تقریباً فیل رہیں اگرچہ ہندوستانیوں کو بہت کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن سابق مختصر تحریر سے اجمالی طور پر اندازہ ہو گیا کہ ان پالیسیوں کے فیل کرنے اور ہندوستانیو

کو ان کے مہلک اثرات سے نجات دلانے کا سہرا اگر باندھا جا سکتا ہے تو علمائے ملت کے مبارک سروں پر۔

بہرحال اب تیسری پالیسی بروئے کار آئی۔ جس کا سلسلہ تو ابتدا ہی سے چل رہا تھا۔ مگر چونکہ ۱۸۵۷ء تک انگریز کی پالیسی یہی تھی کہ مسلمانوں کو پیچھے رکھا جائے بنا برین جسقدر مسلمانوں میں تعلیم کی کمی رہی۔ اس پالیسی کا اثر بھی مسلمانوں پر کم پڑا۔

بہرحال ۱۸۷۱ء میں گورنمنٹ ہند نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی بدل کر ۷ اگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبجات کے پاس احکام بھیجے جنکا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے۔ گورنمنٹ اسکولوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں اور نیز دیسی زبانوں کی تعلیم جاری کی جائے۔ اور مسلمان استاذ مقرر کئے جائیں اردو اور انگریزی کے جدید اسکولوں کو مالی امداد دی جائے۔ مسلمانوں کی دیسی زبان کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ یونیورسٹیوں میں عربی، فارسی کی تعلیم کا اضافہ کیا جائے [1]

اس کے بعد اگرچہ عم محترم مولانا سید طفیل احمد صاحب کو نیز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو یہی شکایت ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے بار بار کمیٹیاں ہوتی رہیں اور مسلمانوں کے متعلق اس قسم کی سفارشات کرتی رہیں مگر خاطر خواہ نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہو سکا۔ کیونکہ گورنمنٹ کی کوتاہی اور کچھ ہندوؤں کا دفتری اقتدار ان سفارشات کی تکمیل میں آڑے آتے رہے۔

---

[1] تاریخ التعلیم از سید محمود صفحہ ۱۴۹ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۲۱

مگر ہمیں اس موقعہ پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ اس اشاعت تعلیم کا۔ مقصد کیا تھا مسلمانوں پر اوس کا اثر کیا پڑا۔ اور علمار ملت نے اوسکا تدارک کیا کیا۔

پہلے بھی گذر چکا ہے کہ لارڈ میکالے نے جب، ۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دی جانے کی حمایت کی تھی۔ تو اوس نے اپنی رپورٹ میں اپنی رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو۔ مگر مذاق اور رائے۔ الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو[1]"

اوس کے بعد اب ۱۸۷۰ء میں جب مسلمانوں کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی بدلی تو ہیجر یاسو اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم اور ملازمت سے نکالکر اون کی ذہنیت نہیں بدل سکتی۔ چنانچہ ہیجر موصوف لکھتا ہے۔

لارڈ میو وائسرائے ہند نے محسوس کیا کہ تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں اور سرحدیوں کو امداد بھیجتے ہیں۔ جہاں سے ہندوستان کو خطرہ رہتا ہے[2]

مسٹر جیمس اوکنیلی" جو مسلمان باغیوں کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا اوس نے بھی مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی سفارش کرتے ہوئے یہ ہی دلیل بیان کی تھی۔

---

[1] تاریخ تعلیم ز میجر باسو بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۸۔ [2] ہندوستان تا ستا ج برطانیہ کے عہد میں از میجر باسو بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۳۷ صفحہ ۱۲۹ صفحہ ۱۶۴

اور "ہنری ہیرنگٹن طامس" نے اپنے رسالہ "ہندوستان میں گذشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی میں صاف صاف کہا تھا۔

میں نے پہلے ہی بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصلی محرک ہندو تھے اور اب میں یہ دکھانے کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ نہ کرنا چاہتے تھے۔

وہ (مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور و ظالم رہے ہیں۔ ہمیشہ ان کا منصب یہی رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو۔ اور عیسائیوں سے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو۔ مسلمان ایسی گورنمنٹ کے جسکا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں (دعوٰی حکومت خود اختیاری)

اس قسم کے بہت سے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جنکا فیصلہ یہی ہوگا کہ اب انگریزی تعلیم کا مقصد قرار دیا گیا کہ۔

(الف) برطانوی شہنشاہیت کے لئے وفادار کاسہ لیس پیدا کئے جائیں

(ب) چونکہ احکام قرآنی کی موجودگی میں برطانوی شہنشاہیت سے وفاداری ممکن نہیں۔ لہذا مسلمانوں کو مذہب سے نا آشنا بنایا جائے۔

(ج) نصاب تعلیم ایسا ہو کہ پڑھنے والے برطانوی شہنشاہیت کے لئے ایماندار غلام بن جائیں۔ یعنی احترام مذہب، احساس وطن، احترام علماء اور ماضی کی روایات سے محروم کر دئے جائیں۔ آپس میں تفریق بڑھے۔ ہندو مسلم منافرت،

پیدا ہے۔ اور تفرقہ ڈالو حکومت کرو کی پالیسی کامیاب ہو۔

---

بیشک آج سے ستر سال پیشتر ہمارے بزرگ نہیں پہچان سکے کہ تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے۔ لیکن آج ہمیں اجازت دی جائے کہ محبان وطن سے فتوی طلب کریں کہ ایسی تعلیم اور اوس کی ترویج و اشاعت جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا۔ توجروا۔

# فریب خوردہ عقلمند

## مسلمانوں کے نادان دوست یا دانا دشمن

سر سید احمد خان مرحوم کی جد و جہد، جفاکشی اور قربانیاں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر آپ کی تمام جد و جہد انگریز کے نکتۂ نظر کے عین مطابق واقع ہوئی ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی کے بعد جب مسلمانوں کو کچھ ہوش آیا تو بلاشبہ اون کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ حکومت ختم ہوچکی تھی۔ صنعت اوس سے پہلے برباد کی جاچکی تھی۔ املاک و جائیدادیں ضبط کی جاچکی تھیں۔ سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی قرار دی جاچکی تھی۔ یعنی آج تک کے علماء جاہل قرار دے دئے گئے تھے۔ بڑے سے بڑے محدث اعلیٰ سے اعلیٰ ادیب کی قدر انگریز کی نظر میں ایک دیہاتی جاہل سے زیادہ نہ رہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اوسوقت ملازمت سے بھی محروم تھے۔

ہندوؤں کو بڑھانے کی پالیسی پر مدت سے عمل کیا جارہا تھا مسلمانوں کو

مشتعل کرنے والی چیزیں نظام تعلیم کا جزو بنائی گئی تھیں۔ اس طرح اُن کو جدید تعلیم سے دور کیا جا رہا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُس وقت وہ ملازمت سے محروم تھے۔ بلاشبہ مفکرین ملت کا فرض تھا کہ مستقبل کے متعلق فکر کرتے اور ہندوستان میں باعزت زندگی کی سبیل سوچتے۔

اس زمانہ میں مفکرین اور مدبرین ہند نے کیا کیا۔ اس کی تفصیلات تو آپ "روشن مستقبل" (مصنفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب علیگ) میں ملاحظہ فرماویں۔

مختصر یہ کہ۔

(الف) یہ تو بالاتفاق تسلیم کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا انتظام مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اسلامی کلچر کے لئے تباہ کن ہے۔ اور اس کے [illegible] ذالتناب۔

(ب) مگر تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دو خیال تھے۔ اول یہ کہ حکومت ہی سے نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی ذمہ دار حکومت ہی کو قرار دیا جائے تاکہ حکومت ہند جو تعلیمی شعبوں پر خرچ کرے وہ صرف ہندوؤں کے لئے ہی نہ ہو جائے۔ بلکہ مسلمان بھی اپنا حق وصول کرتے رہیں دوسری رائے یہ تھی کہ تعلیمی نظام مسلمان اپنے طور سے اپنی ذمہ داری پر قائم کریں گورنمنٹ سے صرف امداد لیتے رہیں۔

بدقسمتی سے سرسید صاحب اور ان کی پارٹی کی رائے یہی تھی اور یہی ثانی الذکر رائے قابل عمل قرار دی گئی۔

(ج) طریق تعلیم پر بحث شروع ہوئی تو مسلمانوں کی بدقسمتی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ سرسید صاحب کی رائے یہ تھی کہ مسلمان انگریزی معاشرت اور انگریزی کلچر اختیار کر لیں۔ تاکہ انگریز کی نظر میں وہ عزت حاصل کر سکیں۔ چنانچہ مصنف روشن مستقبل تحریر فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لئے سر سید نے دو طریقے اختیار کئے اول اصلاح معاشرت اور دوسرے اصلاح مذہب۔ اصلاح معاشرت کے لئے سر سید نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے انگریزی تمدن اختیار کر لیا تھا۔ اور انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا جو ہندو مسلمانوں کو ناگوار تھا۔ مگر انگلستان سے لوٹ کر سر سید نے یہ اضافہ کیا کہ اس کام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی۔ یہی طریقہ ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا۔ اس لئے سر سید کو اپنے خیالات میں بہت تقویت ہوئی تھی چنانچہ آپ نے تہذیب الاخلاق میں لکھا۔

ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے۔ سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں اون کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپین جیسا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں ملکر بیٹھتے ہیں تو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اور امید ہے کہ اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں۔ اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں۔ لہ

مذہب کا اپنا نظریہ کے مطابق عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ اون کا ذبیحہ نا رنج تھا۔ اس لئے سر سید نے مسلمانوں کے لئے گردن مروڑی مرغی کا کھانا ........ جائز قرار دیا۔ جوتا پہنکر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب مانا جاتا تھا

لہ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۵۔ د صفحہ ۱۳۰۔ ۱۲

تھا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور داڑھی منڈوانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی ۔[1]

اس سے انکار نہیں کہ رد عیسائیت میں سرسید نے کچھ تحریریں شائع کیں جنپر سرسید کے پیرو کار آج تک فخر کرتے ہیں۔ مگر انصاف پسند حضرات ہمارے اس خیال کی ضرور تائید کریں گے کہ سرسید کے طرز جواب سے مسلمانوں کے دلوں سے حدیث، قرآن پاک، مذہب اور علماء کے احترام کو کافور کر دیا۔

سرسید کی تصنیفات کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ سرسید کسی اعتراض کا جواب قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں نہیں دیتے۔ بلکہ جواب کا ڈھانچہ اپنی عقل سے تراشتے ہیں۔ اور پھر توڑ مروڑ کر احادیث اور آیات کو اوس اختراعی تخیل پر منطبق کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام کی صداقت ہر ایک اعتراض سے پاک ہے۔ اعتراض کرنے والے اوس صداقت کی روشنی تک یا تو پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ یا جان بوجھکر نادانی کی دھول ڈالتے ہیں۔ اور روشن نور کو باطل کی تاریک چادروں میں چھپا کر دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ اب حقیقی اور اصلی جواب صرف یہ ہی ہو سکتا ہے کہ اون باطل کی چادروں کو چاک کر کے شریعت اسلام کے اصلی اصول اور اوس کے سچے اور صادق منشاء کو واضح کر دیا جائے۔

مگر بلاشبہ اس کے لئے وسیع علم اور کافی تبحر کی ضرورت ہے۔

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۱۸۱ - ۱۲

چنانچہ مولانا محمد رحمت اللہ صاحب اور دیگر اکابر علمائے محققین جن کے نام بڑے بڑے پادری لرزتے رہے - اور جن کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی بہت سی زبانوں میں شائع کئے گئے - ان کا طرز یہی تھا -

مذہب کے کسی معمولی جزیہ کو تبدیل کئے بدون دندان شکن جوابات سے - اعتراض کرنے والوں کے دانت کھٹے کر دئے - مگر سر سید صاحب نے اپنی عقل کو اپنا رہبر بنا کر تحقیق و تدقیق سے بے خبر ہو کر الٹے سیدھے جوابات سے کتابوں کو پر کر دیا - سر سید کے ماننے والے حضرات اون جوابات سے بیشک خوش ہوئے مگر علمائے ملت کے نزدیک وہ جوابات سراسر اعتراضات تھے - علمائے ملت نے سر سید کو تنبیہ کی تو بیچارہ اون کے عالی دماغ کے لئے انتہا درجہ کی توہین تھی بھلا جو سر انگریزوں کی چوکھٹوں پر رگڑا جائے اور حریم لندن کے طواف سے دماغ کو روشن کر چکا ہو - اوس کے لئے کب ممکن تھا کہ وہ کوئی بات غلط کہہ سکتا -

چنانچہ علمائے کرام کی تنبیہ پر نہ صرف یہ کہ علماء ہی کو مغلظات سنائیں بلکہ معاذ اللہ احادیث کو غیر قابل اعتبار تمام قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا - اور انھیں علماء ہود کا نہ صرف مقلد بلکہ اون سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا بتایا - اور لکھا کہ ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقہ سے (فلاں) مسئلہ کو مخول کیا ہے کہ بجز اس کے کہ خدا انھیں معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا [1]

اُسی کے ساتھ سر سید نے اپنی ذاتی رائے کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ

---

[1] تفسیر سر سید جلد چہارم صفحہ ۱۳۰ -

ہمارے سوا، تمام مفسرین اور علمار متقدمین (نعلاں) آیت کے معنی اُلٹے سمجھے مگر اس کہنے کی ہمیں پرواہ نہیں لہ

خدارا بتایا جائے کہ کیا اس طرز جواب سے کوئی اسلام کی خدمت ہوئی یا اسلام کو دنیا کی نظر میں اور بھی زیادہ حقیر کیا گیا کہ اوس کے ساڑھے بارہ سو سال کے مفسر، علمار اور فقہار اس درجہ غبی اور نادان گذرے ہیں کہ صحیح بات نہ سمجھ سکے (العیاذ باللہ)

عجیب لطیفہ یہ تھا کہ اعتراضات انگریزی میں اور اون کے جوابات جنمیں علمار ملت، مفسرین، احادیث اور محدثین کا مذاق اڑایا جاتا تھا وہ اردو میں۔

سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح انگریزی میں لکھی۔ جسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کئے۔

مگر سرسید نے اوس کے جواب میں "خطبات احمدیہ" اردو میں لکھکر کھلے طور پر لامذہبی اور بے دینی کی تعلیم دی۔ یعنی مذہب کے نام پر لامذہبی کی تعلیم۔ اور مذہب سے متنفر کرنے کی جو اسکیم انگریز کے دماغ میں تھی۔ سرسید نے جان بوجھکر یا نادانی سے اس اسکیم کی تکمیل کے لئے اسطرح اپنی خدمات پیش کر دیں۔ (افسوس) ع

برین عقل و دانش بباید گریست

آج ہم غلام احمد بیگ قادیانی کو برا کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام دجالوں کی رہنمائی سر سیّد نے کی۔

---

لہ تفسیر سر سید احمد جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۔ ۱۲

سرسید ہی سے ہندوستان میں یہ طریقہ رائج گیا کہ قرآن کے وہ معنی کرو جو دلکو بھائیں۔ اور احادیث میں سے صرف اون احادیث کو صحیح مانو جو مطلب کے موافق ہوں۔ اور باقی سب کا انکار کر دو۔

اسپر جب علمار ملت نے احتجاج کیا تو جارہانہ تہذیب کے مہذب دیوتا نے ان پاکباز فدایانِ ملت کے لئے وہ الفاظ تراشے۔ جنپر انسانیت بھی نفرت کرتی ہے۔

احمق۔ ناعاقبت اندیش۔ مردوں کی روٹیاں کھانے والے۔ فاتحہ درود سے شکم پری کرنے والے۔ معمّم۔ شملشل۔ اندھے عقلمد وغیرہ وغیرہ۔ خطابات اُن اکابر علمار کے لئے تجویز کئے جو خود بھی فاتحہ، درود۔ مردوں کی روٹیوں اور اس قسم کے بے جا مصارف کے سختی سے مخالف تھے۔ اور سو سال[عہ] پیشتر سے ان رسومات قبیحہ کے برخلاف جہاد کر رہے تھے۔ اور سرسید سے کہیں زیادہ ان مراسم کی اصلاح کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ انگریزی الہامات کے بموجب مسلمانوں نے اون کا نام وہابی رکھ چھوڑا تھا۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ سرسید کی رائے اور اون کی جد و جہد صرف اسی نقطہ پر منحصر ہوگئی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی تمدیت بھی ہو۔ علمار ملت کو سرسید کے اس نظریہ سے سختی سے اختلاف تھا۔

---

عہ حیات جاوید کے بیان کے بموجب سید صاحب کا نسبی تعلق اون امام شاہیوں سے تھا جن کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات میں گذرا۔ محمد میاں

رہے علماء کرام۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بھی اس پر آمادہ تھے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی طور پر اسلامی تعلیمات کا انتظام کر دیا جائے (ملاحظہ ہو روشن مستقبل صفحہ ۲۰۴)

**نتیجۂ کلام** آپ سر سید صاحب کے اس تمام اصرار اور ضد کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس پر انہوں نے اپنی آخری جدوجہد صرف کر دی۔ حتیٰ کہ اسی میں اون کی وفات ہوئی۔ پھر لارڈ میکالے کے اوس نظریہ کو ملاحظہ فرمائیے۔

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایائے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو۔ مگر مذاق اور رائے۔ الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

اس کے بعد آپ غور فرمائیے کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنے ہی ہاتھوں گورنمنٹ کی منشاء کو پورا کیا حتیٰ کہ مہربان گورنمنٹ کو اس کا ذمہ دار بنانا بھی گوارا نہیں کیا۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کس طرح برٹش امپیریلزم کی نظر میں اتنا معزز اور محبوب ہوا کہ صرف اوس کے خطابات ہی ایک داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال بظاہر صحیح ہے کہ اس حیثیت کا کوئی ہندوستانی برطانوی ملازمت سے اتنے خطابات نہیں حاصل کر سکا۔

بہر حال تہذیب اور متانت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم۔ آنریبل، ڈاکٹر، سر سید احمد خاں صاحب بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ کا نام عزت سے لیں۔

لیکن افسوس ہے کہ تاریخ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ اپنے زمانہ میں نا

... ۱۸۷۸ء ... روشن مستقبل صفحہ ۱۳۶

بسا اوقات صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتا۔ مگر نتائج بہت جلد کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کر کے عالم آشکارا کر دیا کرتے ہیں۔

زمانہ حال، ماضی کا ثمرہ ہے اور مستقبل کے لئے ایک تخم کی حیثیت رکھتا ہے ہمیں آج اپنے پیش رو حضرات کے اعمال کا محاسبہ کرنا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہم ان کو مطعون کریں۔ بلکہ اس لئے کہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے لئے شاہراہ عمل تلاش کریں

# قیام دار العلوم دیوبند

سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ کو گل ہوئے ۱۳ سال گذر گئے۔ ہندو اور مسلمان حریت اور استخلاص وطن کی آخری جد و جہد میں ناکام ہو چکے، سبز رنگ کا قومی نشان صلیبی نشان کے سامنے سرنگوں ہو چکا۔ دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم کے بجائے یونین جیک لہرا رہا ہے۔ ایک ایک کر کے ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا جلا وطن کر دیا گیا جس نے تحریک حریت میں کوئی بھی جد و جہد کی تھی۔ سیکڑوں علماء ہیں جنھوں نے دار و رسن کی مظلومانہ موت کو لبیک کہا۔ اور جام شہادت پیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

ہزاروں خاندان ہیں جو جاہ و جلال کی سربلندیوں کے بجائے بے کسی، تباہی اور خانہ بربادی کی پستیوں میں گر کر ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة کا تختہ مشق بن چکے

مختصر یہ کہ انقلاب کی تباہ کاریوں نے مسلمانوں کو اس درجہ پست ڈال کہ عمل تو درکنار سیاست کے نام سے بھی وہ لرزنے لگے۔

خفیہ پولیس[عہ] کے انسانیت سوز کارناموں نے اوقات سحر میں بھی بددعا کو موت کے مرادف بنادیا

ہندوستان کے طول و عرض پر عیسیٰ مسیح کے مذہب کا جھنڈا لہرانے کے شوق میں عیسائی اور مسلم نما پادری سانپ بچھو کی طرح ظلمت کدۂ ہند کے چپہ چپہ میں رینگنے لگے نظام تعلیم کی تباہی نے ایک عام جہالت کی چادر تمام ہندوستان پر تان دی۔ شاہ عالم کے معاہدہ کے برخلاف حکومت کی زبان انگریزی قرار دیکر عربی اور فارسی کے تمام مکاتب کو یکسر فنا کردیا گیا۔ علمائے ملت کو دیہاتی جاہل سے بھی زیادہ بے حیثیت کر دیا گیا اسکولوں یا کالجوں کا کورس وہ تجویز کیا گیا جو مسلمان بچوں کو عیسائی نہ بنا سکے تو کم از کم اون کی رائے میں اتنی تبدیلی ضرور پیدا کردے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں۔

ایک مصیبت تھی، تباہی تھی جس میں مسلمانان ہند پہلی مرتبہ مبتلا ہوئے تھے۔ تمام چارے ختم ہوگئے تھے تقدیر تدبیر پر غالب آچکی تھی۔

حیرانی تھی کہ جب شجرۂ اسلام کی آبیاری نہ ہو تو اسلام سوز باد سموم کے تیز و تند جھونکوں میں اس نخل نو کا بقا کہاں تک۔[عہ]

عہ دیو بند کے ایک بزرگ نے یہاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجی سے فارغ ہوکر انگریزوں کے لئے بددعا کیا کرتا ہوں مگر میں بددعا سے پیشتر سارے مکان اور دیواروں پر نظر ڈال لیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں۔ ۱۲ (مؤلف) عہ گذشتہ ابواب کے مطالعہ سے واضح ہوگیا کہ اس تاریک دور میں سیاست اور مذہب کا سب سے بڑا مطالبہ یہی تھا (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہاں کچھ وہ بھی تھے کہ اون کے مقدس ایمان کے نور فراست نے دیدہ بصیرت کو
اسقدر تیز کر دیا تھا کہ مستقبل بعید کو اپنے تدبر و تفکر کے آئینہ میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے
دشمنان اسلام - اگرچہ اسلام کے فنا کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن اسلام اپنے
پاکبازوں کے ذریعہ سے اپنا اعجاز دکھانا چاہتا تھا - اور بلاشبہ وہ ایک جدید حیات کے لئے
مچل رہا تھا -

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ؛ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ان ہی پاکبازوں کی پیشانیاں سربسجود ہوئیں - اوقات سحر میں قاضی الحاجات کی
بارگاہ میں دست دعا بلند کئے گئے - ان کے تضرع اور ابتہال پر لطف الہی کی کرنیں سر
زمین ہند کی طرف منعطف ہوئیں - اور ہندوستان میں تحفظ اسلام کی ایک تجویز پر عملدرآمد
شروع ہوگیا - یوں کہو رسالت عظمیٰ کے عہد مقدس کا صفحہ اون کی آنکھوں کے سامنے
آگیا -

---

**بقیہ حاشیہ صفحہ** ) کہ ملت اسلامیہ کو ڈاکوؤں - رہزنوں - اور ایسے افراد سے بچایا
جائے جو مار آستین ہوں - اور ایک ایسا نظام قائم کر دیا جائے - جس کے ذریعہ سے مسلمان
مسلمان رہ سکے - یہی وقت کا اہم ترین فرض تھا - اگر مسلمان مسلمان ہوگا - اسلام اسلام
ہوگا تو سیاست کے انقلابات میں کبھی دبایا نہ جاسکے گا - تلک الایام نداولہا
بین الناس - لیکن اگر مسلمان مسلمان نہ رہے - الحاد اور زندقہ کا نام اسلام رکھدیا
جائے تو اب جو بھی ترقی ہوگی وہ اسلام کی ترقی نہ ہوگی - کفر و الحاد و زندقہ کی ترقی ہوگی
نعوذ باللہ من ان نضل ونضل

# تجویز کردہ لائحہ عمل

سیاست کے نام پر کوئی تحریک انگریزی پالیٹکس میں حرام تھی۔ تنظیم قوم اول تو خود خطرناک چیز تھی۔ پھر کسی مقصد کے بغیر تنظیم ناممکن۔ تنظیم بذات خود کبھی بھی کامیاب نہیں۔ ہاں کوئی مقصد خود بخود نظم پیدا کر دیا کرتا ہے۔ محض وعظ و تبلیغ یا افتار موجودہ نسلوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ مگر آئندہ کے لئے ان چیزوں میں تحفظ ملت کی کوئی قوت نہیں۔

ہاں ایک چیز اور صرف ایک چیز تھی جسکا نقشہ عہد رسالت (علی صاحبہا الف الف صلوات و سلام) میں صفہ کی صورت میں نظر آتا تھا۔

اب اُس کو مدرسہ کی شکل دی گئی۔

یعنی محض اللہ کے توکل پر مذہبی تعلیمات کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے۔ جو مسلمانوں کو مسلمان اور اسلام کو اپنی حقیقت کے ساتھ باقی رکھ سکے

انگریزی کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں ایسے مدارس کا قیام نہایت دشوار تھا کیونکہ زمانہ کا انقلاب۔ طبائع کا تغیر۔ انگریز کا اقتدار ایسے مدارس کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا

علاوہ ازیں گورنمنٹ سے اوس کا تعلق یہ معنی رکھتا تھا کہ انگریزی منشار کے بموجب، مذہب کو مسخ کرنے کی ایک مشین بنائی جائے۔

لیکن ان مقدس اکابر نے تحفظ ملت اور بقار اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی جفاکشی، فاقہ مستی اور ایثار کو منظور کیا۔ اور محض اللہ پر بھروسہ کر کے خاندان ولی اللہی

کے جانشینوں نے سرزمین دیوبند، سہارنپور۔ اور پھر مرادآباد کی طرف عنان جد وجہد کو منعطف کیا۔

دیوبند میں - دارالعلوم - سہارنپور میں مظاہر العلوم مرادآباد میں -

مدرسہ قاسم العلوم عرف مدرسہ شاہی قائم کیا گیا۔

لیکن یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ ان مدارس میں دارالعلوم نے مرکزیت کی شان حاصل کرلی اور واقعہ تو یہ ہے کہ وہ عظمت حاصل کی جس کی نظیر سے مسلمانوں کی تاریخ خالی ہے۔

بیشک ہندوستان میں گیارہ سو برس مسلمانوں کی شاندار حکومت قائم رہی مگر کیا کوئی درسگاہ ملتی ہے جس میں اس اہتمام کے ساتھ حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہو۔ بیشک مدارس لاکھوں تھے ۔ چپہ چپہ پر اسکول تھا مگر افسوس ہندوستان کے طول وعرض میں دارالحدیث یا دارالتفسیر ایک بھی نہ تھا۔ ہاں بیشک مصر و بغداد میں بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جامع ازہر آج بھی اپنی جامعیت میں شہرۂ آفاق ہے لیکن ان تمام کا قیام و بقاء حکومت کے خزانوں پر تھا۔

سوال تو یہ ہے کہ بے کس و بے درماں قوم کا مدرسہ جو اپنی خدمات میں جامع ازہر اور جامعہ نظامیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے بھی بازی لے جائے۔ کیا کوئی اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں وجود میں آیا ہے۔

بلاشبہ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے جو سرزمین ہند میں ظاہر ہوا اور جس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

# دارالعلوم دیوبند کے اصول و مقاصد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے قلم کے تحریر فرمودہ اصول[ع] رسالہ القاسم کے دارالعلوم نمبر (مجریہ ۱۳۴۷ھ) میں شائع ہوئے ہیں۔

ان اصول کی بنا پر بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(الف) آزادی ضمیر کے ساتھ ہر موقعہ پر کلمۃ الحق کا اعلاء ہو۔ کوئی سنہری طمع۔ مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہوسکے۔

(ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ یہ تعلق خودبخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کردے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل

---

ع یہ اصول آٹھ ہیں۔ انمیں سے نمبر ۳، ۴، ۶، ۸ ان صفحات میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے علاوہ ۱، ۲، ۵ ہمارے مضمون کے سلسلہ میں نہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے آپ کوشش کریں۔ اوروں سے کرائیں۔ خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔ (۲) ابقار طعام طلباء بلکہ افزائش طعام طلباء میں جس طرح ہوسکے۔ خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۵)، خوانندگی مقررہ اور اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے تجویز ہو پوری ہوجایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔ ۱۲

پر قائم رکھنے میں معین ہو- اور اسطرح اسلامی عقاید اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے ورنہ کم از کم اوس وقت تک کے لیے محفوظ ہو جائے جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹ اون میں قطعاً نہ پیدا ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے اور اس طرح آپس میں خود بخود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے

(مندرجہ بالا (الف) اور (ب) کیلئے ملاحظہ ہو اصول و ضوابط کی دفعہ ۳ و ۴ و ۵ جن کے الفاظ حسب ذیل ہیں)

" اصل ۳ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا- اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی- جیسے جاگیر- یا کارخانہ- تجارت- یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ- تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا- اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی- کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا- القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے-

اصل نمبر ۴- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے

اصل نمبر ۵- تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے- جنکو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو- بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے (انتہی)

الحمد للہ کہ دار العلوم دیوبند متعدد بار لاکھوں روپیہ سالانہ کی طمع دلائی

دلانے کے باوجود) آج تک گورنمنٹ کے احسان سے آزاد ہے اور نہ مستقبل کے لئے اسی کا
عہد کئے ہوئے ہے۔

خداوند تو اوس کے متوسلین کے قلوب کو بھی ہر ایک ناجائز تاثر سے آزاد
رکھ (آمین)

(ج) کارکنان، خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ اثرات سے محفوظ اور
مامون رہ کر ولی اللہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا رہے۔ جس کے متعلق تمام عالم اسلامی
کا اتفاق ہے کہ وہ سنت قویمہ ہے۔ مسلک اسلاف کے عین مطابق ہے۔ افراط و
تفریط سے پاک۔ صراط مستقیم اور معیار صحیح ہے ملاحظہ ہو اصل ۸۔ جس کے الفاظ یہ
ذیل ہیں۔

یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور
مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب
اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(د) خودداری اور استبداد (جو شرعی نیز تاریخی حیثیت سے بربادی مسلم
کا واحد ذمہ دار ہے) کے برخلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے
ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

چنانچہ اس کے متعلق اصل سوم میں متعدد ضابطوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے
جنکو ہم نمبروار اصلی الفاظ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۱) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو
اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی

مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا ر میں تزلزل آجائے گا۔ الغرض دل سے بروقت مشورہ اور نیز اوس کے پس وپیش میں مصلحت مدرسہ ملحوظ ہو۔ سخن پروری نہ ہو۔

(۲) اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہو۔

(۳) سامعین اوسکو بہ نیت نیک سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کرینگے

(۴) اور نیز اس وجہ سے (یعنی اپنی بات کی پچ نہ ہو بلکہ مفاد مدرسہ پیش نظر ہو) ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔

(۵) نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے (جسکو کاتب حروف نے بعینہ نقل کیا ہے۔ صرف مسلسل عبارت کو پانچ حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔

واضح ہے کہ

مشیران مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے مشورہ میں صداقت اور دیانت کے

ساتھ مفاد مدرسہ کا لحاظ رکھیں۔ اپنی اغراض کی آمیزش قطعاً نہ ہو۔

مہتمم یا کوئی ایک شخص مختار مطلق نہیں ہو سکتا۔ اہل شوریٰ سے مشورہ کرنا مہتمم کا فرض ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ جملہ ارکان شوریٰ جلسہ میں حاضر ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک معتد بہ مقدار موجود ہو (باصطلاح حاضرا کورم پورا ہو)۔

کورم پورا ہونے کے بعد جو رائے طے ہو اوس کی موافقت ہر ممبر پر لازم ہوگی اب لیت و لعل ناجائز اور غلط ہے۔

سرپرست وغیرہ کے لئے ان تمام قواعد و ضوابط میں کوئی گنجائش نہیں، صرف ایک مہتمم ہے جسکو اہل شوریٰ کے ساتھ جوابدہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں بظاہر نمبر ۴ اور نمبر ۵ میں تعارض ہے۔ کیونکہ نمبر ۴ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہتمم پر اگرچہ مشورہ لازم ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اہل شوریٰ ہی ہوں بلکہ اگر کوئی وارد و صادر بھی ہو جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو تو اوس سے بھی مہتمم مشورہ کر سکتا ہے۔ لیکن نمبر ۵ کا مفاد یہ ہے کہ اہل شوریٰ کی معتد بہ مقدار سے مشورہ کرنا ضروری ہے ورنہ مہتمم سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

لیکن نمبر ۵ کی روشنی ہی میں با آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ نمبر ۴ کا تعلق اون امور سے ہے جو مہتمم کے اختیارات میں داخل مانے جائیں۔ ورنہ پھر ظاہر ہے کہ اہل شوریٰ اور مجلس شوریٰ سب بیکار۔

بہر حال ان دونوں نمبروں کا حاصل یہ ہوا کہ امور مشورہ طلب میں بہر حال مشورہ فریضہ مہتمم ہے۔ پھر ایسے امور جو مہتمم کے اختیارات سے بالا ہیں اون میں اہل

سے مشورہ کرے۔ اور جو امور اختیارات مہتمم میں داخل ہوتے ہوئے مشورہ طلب ہوں اون میں اہل مشورہ کی قید نہیں بلکہ کسی خیر اندیش مدارس اہل علم و عقل سے بھی مشورہ کر سکتا ہے۔ یہ ارشاد بانی وشاورهم فی الامر۔ کی اتباع کہ مہتمم کو اون امور میں بھی استصواب رائے کا حکم کیا گیا جو اوس کے اختیارات میں داخل ہیں۔

بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ اصول مشاورت کو تسلیم کرتے ہوئے مہتمم یا صدر کا مختار مطلق ہونا گویا مجلس شوریٰ اور مشورہ کا استہزار اور تمسخر ہے۔ البتہ مشورے کے سلسلہ میں اگر ارکان شوریٰ کی رائے مختلف ہو تو معتد بہ مقدار کے پائے جانے پر غیر معتد بہ کا نظرانداز کیا جانا تو حضرت رح کی عبارت کے پانچویں فقرے سے واضح ہو گیا لیکن سوال یہ رہا کہ اگر ایک جانب میں صرف ایک یا دو کی کمی ہو تو صورت فیصلہ کیا ہوگی۔ آیا صدر یا مہتمم کو حق ہوگا کہ اپنے اختیارات سے اقلیت کو راجح کر دے۔؟

حضرت بانی رح کے اصول پر بار بار غور کرنے کے باوجود اگرچہ مہتمم کے لئے کسی قسم کے خصوصی اختیارات سمجھ میں نہیں آتے۔ بلکہ اوس کے برعکس مہتمم کو بظاہر مجلس شوریٰ اور ارکین کا بہت ہی زیادہ پابند کیا گیا ہے۔ لیکن ایک دو کے تفاوت کی صورت میں کوئی راہ بھی ان اصول میں نہیں بتائی گئی البتہ تعامل ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ فخر الہند مولانا حبیب الرحمن صاحب رح تعلیمات اسلام میں نہایت واضح اور مدلل طور پر اعتبار اکثریت پر بحث فرماکر آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

اس ہمارے بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ عقل کی رو سے درصورت اختلاف

آراراصل فیصلہ قوت دلیل پر ہوگا اگرچہ یہ قوت کسی ایک رائے کو مقابلہ بہت سی آرار کے حاصل ہو۔ لیکن درصورتیکہ قوت رائے معلوم کرنے کا کوئی معیار ہمارے پاس نہ ہوتو۔ اوس وقت قوت کی علامت کثرت رائے عقلار ہے۔ اور کثرت رائے کے حق میں فیصلہ دینا حقیقتاً قوت دلیل ہی کی بناپر ہوگا۔ اس کے علاوہ کثرت رائے کے حق میں فیصلہ دینے کی ایک اولیٰ وجہ بھی ہے وہ یہ کہ جب آرار میں اختلاف ہے اور کوئی قوت جابرہ اس سے اوپر ایسی نہیں جو رائے مغلوب کو رائے غالب پر فوقیت دیدے تو اس اختلاف و نزاع کے مٹانے کی صورت کیا ہوسکتی ہے۔

ہر ذی رائے اپنی رائے پر مصر اوسی کو حق وصواب سمجھے ہوئے اُسی کے موافق فیصلہ کا متمنی ہے۔

ادھر قوت رائے کوئی محسوس چیز نہیں۔ جس کے ماننے پر ہر کسی منکر کو مجبور کیا جاسکے۔

ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے کیونکہ کثرت ایک محسوس چیز ہے؛ اوس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیمات اسلام ۲ ص ۹۶

## حضرت بانی کے اصول کی شرعی حیثیت

کاتب حروف اس وقت ان تمام مسائل پر تاریخی حیثیت سے بحث کررہا ہے۔ فقہی نکتہ نظر سے ان اصول اور پھر تعامل کی حیثیت بتانی مقصود نہیں۔ شرعی حیثیت کے متعلق ایک مفصل فتویٰ اوائل اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اخبار الجمعیتہ کے متعدد نمبروں میں شائع ہوچکا ہے جسکو احقر نے علمار مرادآباد سے تبادلہ خیالات اور کافی تحقیق و تنقیح کے بعد مرتب کیا تھا۔

تاہم اسقدر تنبیہ ضروری ہے کہ دارالعلوم جیسے اداروں کا جب کوئی شخص

بحیثیت مالک واقف نہیں تو بانی ہی کو واقف کی حیثیت دی جائے گی۔ اور اوس کے اصول و قواعد کا وہی احترام لازم ہوگا جو واقف کے شرائط وقف کا۔

بالخصوص جب اس پر تعامل بھی رہا ہو۔

بانی کے بعد مہتمم کی حیثیت ناظر وقف کی ہے اوس کو بذات خود کسی اصول کی تبدیلی کا کوئی حق نہیں۔ ہاں ممبران ادارہ جو ارباب حل وعقد ہیں وہ بانی کے جانشین ہونگے لیکن اصول کی تبدیلی کا حق جانشینوں کو بھی نہ ہوگا۔ البتہ اصول کے تحفظ اور منشاء اصول کے اجراء یا تکمیل کے لئے کچھ ضوابط معین کر سکتے ہیں، مثلاً ایجنڈا۔ یعنی جلسہ کی اطلاع کے لئے خاص مدت کا معین کرنا۔ یا ارکان شوریٰ کی مقدار یا کورم معین کرنا وغیرہ لیکن مشورہ کے قواعد کو توڑ کر تمام کار وبار کو کسی ایک کے سپرد کر دینا۔ یا مہتمم کو بجائے ارکان شوریٰ کے کسی دوسرے شخص مثلاً صرف سرپرست کے سامنے جواب دہ قرار دینا۔ یا کسی کی شخصیت کو ارکین شوریٰ سے بالا ماننا۔ ظاہر ہے کہ وہ حضرت بانی قدس اللہ سرہ العزیز کے معین کردہ اصول کی تنسیخ ہے۔ جو کسی طرح جائز نہ ہوگی ۔

واللہ اعلم بالصواب۔

# خاندان ولی اللہ کے جانشین

## مرکزِ علم کا انتقال

## دیوبند۔ اور بانیان دار العلوم دیوبند

**دیوبند** یہ قصبہ شہر سہارنپور سے جنوبی جانب ۲۰ میل کے فاصلہ پر اور دہلی سے شمالی مشرقی جانب تقریباً ۹۰ میل کے فاصلہ پر آباد ہے۔

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ قصبہ کب سے آباد ہوا۔ البتہ اس کی قدامت کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اس کا وجود تھا۔ ایک مقبرہ کے متعلق جو "شاہ جنگل بانس" کے نام سے مشہور ہے بتایا جاتا ہے کہ حضرت شیخ سعدی رح کے معاصر اور علامہ ابن جوزی کے شاگرد کا مزار ہے۔ اور دیوبند کے بزرگوں سے یہ بھی سنا گیا کہ حضرت شیخ سعدی رح سیاحت ہندوستان کے زمانہ میں شاہ صاحب موصوف سے ملاقات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے۔

اس مزار کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک پختہ تالاب ہے۔ جسکو دیوی کنڈ کہا جاتا ہے۔ اور برہمنوں کی حکومت کے زمانہ کی یادگار بتایا جاتا ہے۔

اس کے گرد اگرد بہت سے مندر ہیں۔ اس مقام کو متبرک مانا جاتا ہے اور اس موقعہ پر ہندوؤں کا ایک میلہ بھی ہوا کرتا ہے۔

آجکل قصبہ کی آبادی تقریباً بتیس ۳۲۰۰۰ ہزار ہے۔ جس میں اکثریت مسلمانوں کی

ہے۔ ایک دراز عرصہ سے عثمانی اور صدیقی شیوخ کے دو خاندان آباد ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں حضرت حاجی سید محمد ابراہیم صاحب لکھنؤ سے سفر کر کے بسلسلہ سیاحت یہاں تشریف لائے اور پھر یہ شاداب خطہ ایسا پسند آیا کہ یہیں قیام پذیر ہو گئے۔ پہلی مرتبہ دیوبند کے ایک صدیقی گھرانے میں اور دوسری ان کی وفات پر سادات بارہ کی ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔

ان کی تشریف آوری سے دیوبند میں سادات کے خاندان کا بھی اضافہ ہو گیا جو ہمیشہ باشندگان دیوبند کی نظر میں محترم رہا۔ ؎۵

شاہی زمانہ میں کچھ جاگیریں بھی اس خاندان کو عطا ہوئی تھیں مگر انقلاب ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں وہ تمام ختم ہو گئیں۔

**خصوصیات** (۱) یہ امتیاز شاید دیوبند ہی کے لئے مخصوص ہے کہ اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ سادات اور شیوخ سے آباد ہے۔

(۲) بدقسمتی سے دارالعلوم دیوبند کی مخالف اور موافق دو جماعتیں تو قصبہ میں موجود ہیں مگر عجب بات یہ ہے کہ عقاید سب کے ایک ہیں۔

(۳) قدیم زمانہ سے مساجد کی زیادتی ہے۔ تیس ہزار آبادی کل ہے۔ جس میں مسلمان تقریباً بیس ہزار ہیں۔ مگر مسجدیں سو سے زیادہ ہیں۔

(۴) ہندو اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں۔ اور پھر اسٹیشن سے بازار میں گذرتی ہوئی ایک سڑک جامع مسجد تک پہونچی ہے۔ اس سڑک کے ایک جانب خاص

---

؎۵ کاتب الحروف کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ محمد میاں عفی عنہ

مسلمانوں کی آبادی ہے۔ دوسری جانب ہندوؤں کی۔ مسلم آبادی میں ہندوؤں کے مکانات دو چار سے زیادہ نہیں۔ البتہ ہندو آبادی میں مسلمانوں کے کئی محلے آباد ہیں۔

(۴) سادات اور شیوخ قصبہ کے سربرآوردہ خاندان ہیں۔ جو پہلے دولت کے لحاظ سے بھی فائق تھے۔ مگر اب اون کی حالت ناگفتنی ہے۔

(۵) یہ خاندان اپنے نسب کی صحت پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں کہ دیوبند کے سوا کسی دوسری جگہ شادی کرنا عار سمجھتے ہیں۔

اس جاہلانہ جذبہ کا یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ ان تینوں خاندانوں کے افراد ایک دوسرے سے کوئی قرابت ضرور رکھتے ہیں۔ مگر برا نتیجہ یہ ہے کہ ان خاندانوں کے تعلقات محدود ہوگئے ہیں اور ترقی اوس سے بھی زیادہ محدود۔

## بانیان دارالعلوم دیوبند

(۱) حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہ العزیز۔ آپ کا تعلق خاندان سادات سے تھا۔ آپ صوفی منش، زاہد اور متقی بزرگ تھے۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کا بیان ہے کہ ایک وقت آپ کو بہت زیادہ رنجیدہ دیکھا گیا۔ کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی کہ جیسے کسی جوان مرگ پر ہو۔ جب سبب دریافت کیا گیا تو بہت زیادہ اصرار کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی۔

آپ تقویٰ طہارت کے باوجود ایک بہت بڑے عامل بھی تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| ہم شریک مشورہ اے نور عین | ہست حضرت حاجی عابد حسین |
| عامل کامل۔ ولی۔ مرد خدا | پائے او بر پائے فخر انبیا ر |

ہم جمالی، ہم جلالی، شان او | کان حلم و مخزن خلق نکو
نقش و تعویذش نشاں نقش قدر | فیض او بر خاص و عامی مثل بدر

دیوبند میں دینیات کی تعلیم کے لئے ایک مکتب کے قیام کا تخیل سب سے پہلے آپ ہی کے ذہن میں آیا۔

آپ نے دیوبند کے دوسرے بزرگ جناب مولانا مہتاب علی صاحب سے مشورہ کیا۔

(۲) مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ العزیز کے عم اکبر (تایا) تھے۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب) نے تحریر فرمایا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مشورہ کرنے کے بعد ایک مکتب کے قیام کی تحریک کی۔

چندہ کے لئے جس نے سب سے پہلے رومال پھیلایا۔ اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حضرت حاجی عابد حسین صاحب ہی ہیں۔ عہ

اس مکتب یا مدرسہ کے قیام کے بعد مولانا محمود عرف ملا محمود صاحب کو استاد کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ سب سے پہلے معلم بھی محمود تھے۔ اور سب سے پہلے

---

عہ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب قدس سرہ العزیز اور دیگر بزرگوں سے ایسا ہی سنا ہے۔ ۱۲

طالب علم بھی محمود جو بعد میں ملت ہندیہ کے لئے آفتاب ہدایت بنکر جلوہ فرما ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں مسلمانان ہند کی جانب سے متفقہ طور پر "شیخ الہند" کا عظیم الشان خطاب حاصل کیا۔

(۳) تیسرے بزرگ جنکو بانیان کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہیئے وہ جناب شیخ نہال احمد صاحب رئیس اعظم دیوبند تھے۔

آپ کے مورث اعلیٰ شیخ لطف اللہ صاحب تھے جو سلطان اورنگ زیب عالمگیر رح کے دیوان تھے۔

آپ کا شاہانہ محل اسوقت محلہ دیوان کے نام سے مشہور ہے۔ جو دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان تعمیر سے متصل ہے۔

جس جگہ پر دارالعلوم کی قدیم تعمیر ہے وہ شیخ نہال احمد صاحب اور ان کے اقارب ہی کی زمین تھی۔ آپ کی سخاوت کی مثالیں آج تک بیان کی جاتی ہیں۔ بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اوس طرف سے گذرنے والی بارات کو اپنے ہاں ٹھہرالیا اور اوس کی دعوت کی۔

جسوقت سیدنا حضرت سید احمد صاحب بریلوی قدس اللہ سرہ العزیز پنجاب جاتے ہوئے اپنے قافلہ کے ساتھ دیوبند پہونچے ہیں تو شیخ صاحب موصوف نے کئی دقت تک میزبانی کی خدمت انجام دی تھی۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے شیخ صاحب کی ہمشیرہ منسوب تھیں۔ اور پھر شیخ صاحب موصوف بھی حجۃ الاسلام کے بہنوئی ہوئے۔

ثانی الذکر رشتہ کی صورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح نے دیو بند میں عقد بیوگان کی تحریک پیش کرتے ہوئے تقریر فرمائی تو مجمعہ میں سے ایک شخص نے حضرت موصوف پر اعتراض کیا کہ آپ کی ہمشیرہ خود بیوہ موجود ہیں۔ یہ محترمہ بیوہ ضرور تھیں مگر اسقدر سن رسیدہ کہ بالکل ہی سفید ہو گئی تھیں۔

مگر جذبۂ تبلیغ و اصلاح کا پرصداقت ولولہ یہ تھا کہ آپ جلسہ گاہ سے فوراً مکان تشریف لے گئے۔ ہمشیرہ محترمہ کے پاؤں میں دستار مبارک رکھدی اور احیار سنت کے فضائل بیان کر کے ان کو نکاح پر آمادہ کر لیا۔ پھر مجمعہ میں تشریف لا کر شیخ صاحب موصوف سے عقد کر دیا۔

مبارک سنت کے احیار کی برکت تھی کہ انتہا درجہ سن رسیدہ ہونے کے باوجود خداوند عالم نے اولاد عطا فرمائی۔

**بانیٔ اعظم** بلاشبہ دیو بند میں پاکیزہ نفس بزرگوں کی ایک جماعت تھی۔ جس نے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی۔ مگر جس مقدس بزرگ نے معمولی مکتب کے خاکے پر دارالعلوم جیسی عظیم الشان تجویز کی بنیاد رکھی۔ وہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح کی ذات گرامی تھی۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب رح کا ذہن خالی تھا۔ چنانچہ جب دارالعلوم کی تعمیر کا مسئلہ در پیش ہوا تو حاجی صاحب نے سختی سے مخالفت کی۔ حاجی صاحب کا اصرار یہ ہی تھا کہ جامع مسجد کی سہ دریاں جو دینی خیال کے پیش نظر بنائی گئی تھیں وہ کافی ہیں۔ [1]

[1] ارواح ثلاثہ حاشیہ حکایت نمبر ۲۵۲ صفحہ ۱۹۱ - ۱۲

مگر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح کے سامنے وہ بلند ترین نقشہ تھا کہ آج وہ مدرسہ دریاں کسی ایک جماعت (کلاس) کے طلبار کے لیئے بھی کافی ہنیں ہو سکتیں صرف دس پندرہ طلبار اون سہ دریوں کے حجروں میں رہتے ہیں۔

اسی بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دارالعلوم کے موجودہ نقشہ کے مؤسس اور بانی صرف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح ہیں

اور باوجودیکہ اس خاکسار کا خاندانی تعلق حضرت حافظ حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ہے مگر اس اعتراف پر لامحالہ مجبور ہے کہ موجودہ دارالعلوم کے بانی سیدنا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہی ہیں۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح کا مولد و موطن قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور تھا۔ آپ طلب علم کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے آپ کو رفاقت حاصل ہو گئی۔

ان دونوں بزرگوں کے ذہن و ذکاوت کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کی رونمائی ہے۔ آج ہمارے پاس ان حضرات کی تصانیف موجود ہیں۔ وہ اس رونمائی کے لیئے کافی ہیں۔

**سلسلہ تلمذ** | ان دونوں بزرگوں نے عموماً کتابیں حضرت مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھیں جو اوس مدرسہ کے مدرس تھے جو اوس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی جانب سے علوم عربیہ دینیہ کی تعلیم کے لیئے اس زمانے قائم کیا گیا تھا

کہ ہم غلام مسلمانوں کے سامنے علم دوستی اور مذہب پروری کا مظاہرہ کرکے ان کو گرویدہ بنایا جائے۔

مولانا مملوک العلی صاحب کا وطن قصبہ نانوتہ تھا جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کا وطن تھا، آپ حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب سیدنا حضرت مولانا شاہ عبد العزیز قدس اللہ سرہ العزیز کے شہرہ آفاق اور رشید ترین شاگرد تھے۔ جو ہر فن میں یکتائے روزگار تھے۔ اور خصوصًا رد شیعہ سے بہت زیادہ شغف تھا۔

حجۃ الاسلام اور امام ربانی کے دوسرے استاذ جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب رہے تھے۔ جو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے مشہور حضرت تلمیذ اور اس خاندان کے خاص عقیدتمندوں میں تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب نے حدیث شریف حضرت شاہ عبد الغنی صاحب سے پڑھی۔

سیدنا شاہ عبد الغنی صاحب حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے تلمیذ اور جانشین یعنی مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے۔

بہر حال یہ دو گوں بزرگ نیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو سب سے پہلے دار العلوم دیوبند کے مدرس اول ہوئے اور جو حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے خلف رشید تھے، ایک یا دو واسطے سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے شاگرد ہیں۔

## دیوبند کی وجہ تخصیص

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ وجوہات کیا تخصیص جن کی بنا پر دیوبند کو اس مرکز علوم کے لئے منتخب کیا گیا۔

دیوبند پیشتر سے علمی امتیازات کا مالک نہیں تھا۔ نہ سرزمین دیوبند کسی قسم کی کوئی مرکزیت رکھتی تھی اور عجب اتفاق یہ کہ وہ تینوں علماء جن کے فیوض و برکات کے لئے ارض دیوبند مطلع اور مشرق بنی دیوبند کے باشندے بھی نہ تھے۔

ظاہری اسباب میں اس کا سبب وہی تعلق ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح کو جناب شیخ نہال احمد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے تھا۔

لیکن اس موقعہ پر چند دیگر واقعات کا نقل کرنا بھی یقیناً اہل ذوق کے لئے دلچسپی اور فروغ ایمانی کا ذریعہ ہوگا۔

(۱) قیام دارالعلوم کے بعد اسی جماعت کے ایک بزرگ عـہ جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے عرض کیا ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لئے دعا فرمایئے۔

حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا۔

سبحان اللہ۔ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجدہ ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں مایا کو یہ سرزمین لے اڑی

(۲) حضرت مولانا قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری اکابر اولیاء اللہ سے گذرے ہیں آپ کا زہد و تقویٰ شہرۂ آفاق ہے۔

---

عـہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ۔ ۱۲

حضرت مولانا سید غالب علی صاحب مراد آبادی قاضی صاحب موصوف کے خلیفہ تھے مولانا غالب علی صاحب نے احقر سے فرمایا۔

"دارالعلوم دیوبند۔ مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ اون اسکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جنکو اتفاقیہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے حضرت پیر مرشد مولانا قاضی محمد اسمٰعیل صاحب، نے فرمایا تھا کہ یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کیے گئے ہیں۔

(۳) حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ سیدنا حضرت علی[1] کرم اللہ وجہہ نے ایک مدرسہ قائم فرمایا ہے۔ اوس مدرسہ میں ایک طالب علم سے شاہ رفیع الدین صاحب کی ملاقات ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد جب دارالعلوم دیوبند قائم ہو چکا۔ اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم بنائے گئے تو آپ نے ایک روز ایک طالب علم کو دیکھکر فرمایا کہ یہ وہی طالب علم ہیں جن کو میں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مدرسہ میں دیکھا تھا۔

(۴) حضرت سید احمد صاحب بریلوی جب سرزمین دیوبند سے گذرے، تو اور

---

[1] سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انا مدینۃ العلم وعلی بابہا۔ میں مدینہ علم ہوں اور علی اوس کا دروازہ ہیں۔ خواب میں حضرت رض کا مدرسہ قائم کرنا۔ اس حدیث کے بموجب ایک خاص لطیفہ ہے ۱۲-

زمانہ میں اوس جگہ جہاں دار العلوم قائم ہے کوڑیاں پڑا کرتی تھیں۔

سید صاحب نے فرمایا دیہاں علم کی بو آتی ہے) اور پھر ادس کے قریب قیام فرمایا۔ اس قسم کے اور بھی ایمان کو تازہ کرنے والے لطائف سنے گئے ہیں۔ جنکو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(ھ) یہی روایت حضرت مجدد صاحب، قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق بھی سنی گئی ہے (جیسا کہ پہلے گذرا)

# قیام و تعمیر۔ دار العلوم دیوبند

**تاریخ قیام** ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء تقریباً۔ یوم پنجشنبہ۔ اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے۔ جسمیں ارض بطحا کا چشمۂ علم سرزمین ہند سے پھوٹا۔ رشد و ہدی کا ایک پودا سرزمین دیوبند میں لگایا گیا۔ جو بہت جلد شجرہ طوبی بنا اور اوسکی شاخ شاخیں دنیا و اسلام کے علمی گلشنوں کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماءٓ تؤتی اکلہا کل حین۔

تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا اور مسجد چھتہ[عــــ] کے

---

عــــ اس باب کے تمام مباحث رسالہ القاسم دار العلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ دارالعلوم ثلاثہ سے ماخوذ ہیں مسجد دار العلوم دیوبند سے متصل جانب جنوب میں ایک قدیم مسجد ہے۔ جو مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد بزرگان دیوبند کا اعتکاف گاہ رہی ہے۔ اور بابرکت مسجد مانی جاتی ہے۔ ۱۲

کے فرش پر درخت انار کی ٹہنیوں کے سایہ میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔

چندہ کے لئے رومال پھیلایا گیا اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد[1] تھا۔ سب سے پہلا معلم محمود[2]۔ اور متعلم بھی محمود[3]۔

۱۵ محرم الحرام کو ایک اشتہار کے ذریعہ سے قیام مدرسہ کا اعلان کیا گیا۔ جس میں ظاہر کیا گیا کہ اس وقت تک چار سو ایک روپیہ آٹھ آنے چندہ جمع ہو چکا ہے اور سولہ طالب علموں کی خوراک وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور جیسے جیسے چندہ بڑھتا رہے گا طلبا کے لئے سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

ایک کورد میں ابتدا ہی سے طلبا کا ہجوم اور استعداد چندہ کی فراہمی بلند ترین مستقبل کی روشن دلیل تھی۔

اختتام سال تک طلبا کی تعداد ۷۸ تک ہو گئی۔ جن میں اٹھاون بیرونجات کے تھے۔ ۲۰ طلبا کی خوراک کا ذمہ اہل شہر نے لیا۔ مدرسین میں بھی اضافہ کرنا پڑا چنانچہ ان کی تعداد پانچ تھی۔

---

[1] حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رح۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح کی وفات کے بعد ۱۲۹۷ھ میں جب تقسیم انعام کا جلسہ ہوا تو مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک فارسی نظم پڑھی تھی اس کا ایک شعر یہ تھا۔ ؎

مرد حق عابد صداقت کیش       او بس گسترانده روماشش

اور ایک دوسرا مصرعہ یہ تھا۔       چیزے از حیات اموالش۔

[2] جناب مولانا محمود صاحب عرف ملا محمود [3] سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ۔

**سب سے پہلے مدرس** دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود صاحب تھے۔ جنکی تنخواہ ؁ ماہانہ تھی۔

**سب سے پہلے متعلم** حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔

**سب سے پہلے صدر مدرس** طلبہ کے روز افزوں ہجوم نے بہترین مدرسین کے جمع کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو صدر مدرس کی حیثیت سے بلایا گیا۔ جو اجمیر شریف یا کسی دوسرے مقام پر خدمات تدریس معقول مشاہرہ پر انجام دے رہے تھے۔ یہاں ان کا مشاہرہ مبلغ ؁ ماہانہ طے کیا گیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت مولانا مملوک العلی صاحب (استاذ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب) کے صاحبزادے تھے۔ نقلی اور عقلی علوم کے ماہر تھے۔ اور ہر ایک فن سے کافی واقفیت تھی۔ آپ کی جامعیت بے نظیر تھی۔ سنا گیا ہے کہ جو کتاب آپ کے سامنے آجاتی خواہ وہ کسی فن کی ہو۔ اور خواہ اوس کا مصنف کوئی ہو اوسکو مطالعہ کے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔

یہ بھی سنا گیا ہے کہ آپ مطالعہ کے وقت عموماً دونوں کہنیوں کو ٹیک کر بیٹھا کرتے تھے جس سے آپ کی کہنیوں میں گٹّے پڑ گئے تھے۔

مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| مولوی یعقوب صاحب اوریں | عالم جملہ فن و نسب و دیں |
| ہم بہ علم باطنی دارد کمال | ہست مقبول خدا رند و الجلال |
| مرشد کامل ولی بے بدل | عابد و زاہد تقی بے خلل |

لے تخمین دارالعلوم دیوبند۔ دارالعلوم نمبر سنہ ۱۹

**سب سے پہلے مہتمم** | حضرت حاجی حافظ سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنائے گئے

مگر آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی۔ زیارت بیت اللہ شریف کا عزم کر لیا۔ اہل شہر کو یہ بھی خطرہ تھا کہ شاید اب آپ واپس نہ ہوں۔ چنانچہ آپ کی جگہ پر یکم شعبان ۱۲۸۴ھ کو حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنایا گیا۔

آپ اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند آپ کے خلیفہ تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ دور اہتمام سے پیشتر باہر جنگل میں رہا کرتے تھے۔ جب آپ کو مہتمم بنانے کا خیال ہوا تو کچھ آدمی آپ کو لینے کے لئے گئے آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو ایک رفیق کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت حجۃ الاسلام کا پیغام سنکر آپ فوراً تشریف لے آئے۔

۱۲۸۵ھ میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے حج بیت اللہ شریف کا عزم فرمایا۔ تو حضرت حاجی عابد حسین صاحب کو دوبارہ اہتمام سپرد کیا گیا۔

۱۲۸۶ھ میں جامع مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ جسکی نگرانی حضرت حاجی عابد حسین صاحب کے سپرد تھی اور آپ کو اہتمام مدرسہ کی ذمہ داری کی فرصت کم ملتی تھی۔ لہٰذا حضرت حاجی صاحب کو کلی طور پر تعمیر جامع مسجد کا نگراں قرار دیتے ہوئے۔ دوبارہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنایا گیا۔

**سب سے پہلی مجلس شوریٰ** | حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ حضرت حاجی

عابد حسین صاحب۔ مولانا مہتاب علی صاحب دیوبندی۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی (حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی۔ شیخ نہال احمد صاحب دیوبندی۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندی

**سب سے پہلے دورۂ حدیث** دارالعلوم میں ۱۲۹۳ھ میں سب سے پہلے حدیث شریف کا دورہ ہوا۔

**سب سے پہلے فارغ التحصیل** ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو سب سے پہلے مندرجہ ذیل پانچ حضرات نے دارالعلوم دیوبند سے سند تکمیل اور دستار فضیلت حاصل کی۔

(۱) سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مولانا عبد الحق صاحب ساکن پور قاضی۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی۔ مولانا فتح محمد صاحب تھانوی مولانا عبد اللہ صاحب جلال آبادی۔

**غیر معمولی شہرت** دارالعلوم دیوبند کو ابتدا ہی سے عام مقبولیت اور غیر معمولی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ آپ نے مطالعہ کیا کہ پہلے سال میں اٹھارہ طلباء بیرونجات کے اس مدرسہ میں داخل ہو چکے تھے۔ امسال کی تعداد ایکسو تراسی تک پہونچ چکی تھی

**حسن انتظام** خلوص اور للہیت کے ساتھ۔ حسن انتظام۔ ترقی کا پایہ ارتقا تھا چنانچہ ہر سال لازمی دستور تھا کہ امتحان سالانہ نہایت اہتمام اور انتظام کے

---

لہ مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہٗ آپ ہی کے نام آور صاحبزادگان ہیں۔ ۱۲

ساتھ ہوتا - امتحان کے لئے باہر سے حضرات بلائے جاتے اور معائنہ لکھتے تھے - اسیطرح سالانہ حسابات کی جانچ ہوتی - اور پھر عام جلسہ میں تمام سال کی روئیداد - طلبہ کے نمبر سنائے جاتے - طلبہ کو حوصلہ افزا انعام دئے جاتے وغیرہ وغیرہ -

**تلخ حقیقت** یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل قصبہ نے مدرسہ، طلبہ اور کارکنان مدرسہ کے ساتھ انتہائی خلوص اور صداقت کا اظہار کیا - اپنی حیثیت سے زیادہ مدرسہ کی امداد فرماتے رہے - مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے اگرچہ نہایت تلخ ہے کہ اس سرچشمۂ رشد و ہدی سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہ رہے -

تقسیم انعام و دستار فضیلت کے اسی جلسہ میں جو ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو ہوا تھا - جس میں اطراف و جوانب کے علماء اور مشائخ کافی تعداد میں تشریف لائے تھے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ نے ایک تقریر فرمائی تھی - اس کے مندرجہ ذیل جملوں سے اہل شہر کی کوتاہی اور مدرسہ کی عالمگیر شہرت کا اندازہ ہوتا ہے

دور دراز سے لوگ آئے اور اس دولت کو لوٹ لے گئے - پر یہاں کے باشندے ویسے ہی خالی دامن پڑے رہے - ہائے افسوس اس مدرسہ کی خبر جس کے باعث دیوبند کا نام چار کھونٹ عالم میں پہونچ جائے - دیوبند والوں کے کان میں نہ پہونچے - چند ہند کے طالب علم جو شوق علم سے مکہ معظمہ میں پڑھتے تھے - دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سنکر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آپہونچے - مگر کیا حسرت کی بات ہے کہ دیوبند والوں سے مدرسہ تک نہیں پہونچا گیا - اطراف و جوانب کے لوگ شوق تماشا میں مدرسہ دیوبند کو آآ کر دیکھیں - مگر دیوبند کے طالب علم کبھی بھولے بھٹکے بھی ادھر کو نہ نکلیں - ؎

؎ نمبر محرم ۱۳۵۱ھ صفحہ ۵

## مکانات مدرسہ کی تبدیلی اور تحریک تعمیر

چھتہ کی مسجد میں مدرسہ ابتداءً رہا اس کے بعد قاضی کی مسجد میں اور کرایہ کے مکانات میں رہا۔ لیکن طلبہ کی کثرت ہوئی تو کارکنان مدرسہ رحمہم اللہ اس طرف متوجہ ہوئے کہ مدرسہ کے لئے ایک مستقل مکان بنایا جائے۔ چنانچہ ابتداءً بعض بزرگان مدرسہ نے جامع مسجد میں مدرسہ کی حوائج ضروریہ کو پورا کرنے والی عمارت کی فکر کی۔ چنانچہ جامع مسجد کی تینوں سمتوں میں متعدد حجرے اور کمرے بنوائے چنانچہ چند سال تک مدرسہ جامع مسجد ہی میں رہا۔ لیکن پھر آخر یہی رائے ہوئی کہ مدرسہ فراخ جگہ میں شہر کے کنارہ پر ہونا چاہیئے۔ تاکہ بوقت ضرورت اس میں اضافہ بھی کیا جا سکے نیز مدرسہ اور مسجد کا باہمی مناقشہ بھی پیدا نہ ہو۔

تعمیر جدید کی منظوری کے بعد چار پانچ روز شہر کے مختلف گوشوں کو جگہ کے لئے گشت کیا گیا۔ بالآخر حضرت حجۃ الاسلام کی تحریک پر یہی جگہ پسند کی گئی۔ جہاں اس وقت مدرسہ واقع ہے۔

۱۲۹۱ھ کے جلسہ تقسیم انعام منعقدہ مورخہ ۱۹ ذیقعدہ میں تعمیر مدرسہ کے متعلق حاضرین کو توجہ دلائی گئی۔ چنانچہ ایک معقول رقم نقد وصول ہوئی۔ اور ایک طویل فہرست وعدہ کنندگان کی مرتب ہوئی۔

## ابتداء تعمیر

۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ یوم جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں شہری اور بیرونی حضرات کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ جس کی اطلاع اشتہار کے ذریعہ پیشتر سے دی جا چکی تھی۔ اور جس میں شرکت کے لئے مرادآباد اور علیگڑھ وغیرہ سے آدمی آئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے تقریر فرمائی اور آخر میں اعلان فرمایا کہ سب حضرات

تشریف لے چلیں تاکہ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔

حضرت حاجی عابد حسین صاحب چونکہ جامع مسجد کی سہ دریوں کو مدرسہ کیلئے کافی سمجھتے تھے انھوں نے اس وقت بھی مخالفت کی۔ چنانچہ جب مجمع مدرسہ کی بنیاد گاہ پر جا رہا تھا۔ حضرت حاجی صاحب الگ ہو کر مسجد چھتہ میں تشریف لے آئے۔

لیکن حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کو اپنے ایک رفیق کی ناگواری اور بیزاری کب گوارا ہو سکتی تھی آپ بھی پیچھے پیچھے مسجد چھتہ میں پہونچ گئے۔ اور حاجی صاحب سے پکار کر فرمایا۔ اجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں آپ نے اپنے چھوٹوں کے ساتھ کیا بیرخی اور بے توجہی برتنی شروع فرما دی۔ کچھ ان الفاظ کا ایسا اثر حاجی صاحب پر ہوا کہ بے اختیار گر پڑے اور اتنے روئے کہ آواز نکل پڑی اور کہا کہ حضرت میرا قصور معاف فرمائیے۔ حضرت نے حاجی صاحب کو اٹھا کر گلے لگا لیا اور فرمایا حاجی صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں آپ تو ہمارے بڑے ہیں بزرگ ہیں۔ پھر حضرت حاجی صاحب کو لیکر بنیاد پر پہونچے جو کھد کر تیار تھی۔ اور اس وقت کے اکابر کا خیال تھا کہ کوئی مقدس اور بزرگ ہستی ایسی نہ تھی جو اس موقعہ پر موجود نہ ہو۔

اب یہ گفتگو ہوئی کہ پہلی اینٹ کون رکھے۔ حضرت حجۃ الاسلام اگرچہ اس تمام سلسلہ کے لیے روح رواں تھے۔ مگر آپ ظاہری امتیاز کے موقعہ پر ہمیشہ پیچھے رہتے۔ حتیٰ کہ مدرسہ کی زمین کا بیع نامہ بھی حاجی صاحب کے نام کرایا۔

بہرحال اس موقعہ پر حجۃ الاسلام نے تجویز فرمایا کہ سب سے پہلے حضرت میانجی منے شاہ

---

ئے آپ کی صداقت، سادگی، زہد و تقویٰ مثالیں آج تک زبان زد ہیں۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند کے آپ نانا تھے۔ ۱۲

صاحب خشت بنیاد رکھیں کیونکہ وہ بزرگ بھی ہیں اور سید بھی ہیں - پھر حاجی حافظ عابد حسین صاحب اینٹ رکھیں - ان کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے اینٹ رکھوائی - پھر سب کے ساتھ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اینٹیں رکھیں -

اُس دن اہل اللہ کے قلوب پر ایک عجیب سرور تھا - ایک عجیب خوشی تھی - اور سب کے دل فرحت سے مالا مال تھے - [۱]

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نے اس مبارک بنیاد کو قنادیل معلق سے تشبیہ دی جو توکل اور اعتماد علی اللہ کی سنہری زنجیر میں آویزاں ہے

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب نے اسی مضمون کو مندرجہ ذیل اشعار میں نظم فرمایا ہے -

| | |
|---|---|
| اسکے بانی کی وصیت ہے کہ آسکے لئے | کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائیگا |
| پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ | یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائیگا |
| ہے توکل پر بنا اسکی تو بس اسکا یہ خیال | ایک اگر جائیگا پیدا دوسرا ہو جائیگا [۲] |

**تاریخ تعمیر** مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں - مولانا استاذنا مولوی محمد یعقوب صاحب تاریخ تعمیر = "اشرف عمارات" دیافتہ اند، [۳]

**ارکان شوریٰ** ۱۲۹۱ھ میں حسب ذیل حضرات ارکان شوریٰ تھے -

---

[۱] ارواح ثلثہ - ۱۲ - [۲] ارمغان مدرسہ بحوالہ دار العلوم نمبر صفحہ ۳۹ - ۱۲

[۳] دار العلوم نمبر صفحہ ۱۹ - ۱۲

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح - حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح - حضرت حاجی عابد حسین صاحب رح - مولانا ذوالفقار علی صاحب رح منشی فضل حق صاحب دیوبندی - مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی -

---

# طبقات اکابر دار العلوم دیوبند

پہلا طبقہ = از ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء تا محرم ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء قیام دار العلوم دیوبند

دوسرا طبقہ = از ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء تا ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۴ء

تیسرا طبقہ = از ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۴ء تا ۱۳۳۵ھ

چوتھا طبقہ = موجودہ

**پہلے طبقہ کے اکابر** | سیدنا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز - شیخ العرب والعجم - سیدنا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی - قدس اللہ سرہ العزیز حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز - امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

**دوسرے طبقہ کے اکابر** | حجۃ الاسلام - مولانا محمد قاسم صاحب - قدس اللہ سرہ العزیز -

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب - گنگوہی - قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی - شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

حضرت حافظ حاجی سید عابد حسین صاحب -

حضرت حاجی رفیع الدین صاحب

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز)

حضرت مولانا مہتاب علی صاحب (برادر بزرگ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب) وغیرہ وغیرہ۔

ان دونوں طبقات کے اکابر کے حالات بقدر ضرورت تحریر کئے جا چکے صرف حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر حالات آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیے

## تیسرے طبقے کے اکابر

### از ۱۲۹۷ھ تا ۱۳۳۳ھ

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ قدس اللہ سرہ العزیز

شیخ الہند۔ امام حریت حضرت مولانا محمود الحسن صاحب۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت مولانا احمد حسن صاحب۔ امروہی۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری۔

### امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز۔

حضرت موصوف کے مفصل حالات تذکرۃ الرشید میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ کے رفیق اور مخلص دوست تھے۔ گویا دو قالب تھے جن میں ایک روح کام فرما تھی۔ زمانۂ تعلیم

سے ساتھ ہوا۔ جو آخر تک رہا۔ حجۃ الاسلام کی وفات تک آپ کا سیاسی ماحول ایک ہی رہے۔ اور خدمات میں مقابلہ کرنا احقر جیسے کوتاہ فہم کے لئے گستاخی ہے۔
زہد و تقویٰ اور روحانی کمالات میں مراتب اور تفاوت وہ بیان کرے جو خود ان اوصاف کا ماہر ہو۔

خاکسار جیسا تو دونوں حضرات کی گرانقدر تصانیف دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہے کہ حجۃ الاسلام علم کلام کے امام ہیں۔ جنھوں نے جدید دلائل اور جدید اصول پر جدید علم کلام مرتب کیا۔ اور حضرت امام ربانی فقہ اور حدیث کے ایک جلیل الشان مبصر اور فقید المثال ماہر ہیں۔ جنھوں نے مسائل فقہ کو احادیث پر منطبق کرکے ایسے طرز تدریس کی تعلیم دی۔ جو یقیناً بے نظیر اور بہت زیادہ ضروری تھا۔ حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری فرمایا کرتے تھے۔ "امام ربانی نہ صرف مذہب ابی حنیفہ کے ماہر تھے۔ بلکہ چاروں مذاہب کے فقیہ تھے۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جو چاروں مذہبوں کا ماہر ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا یہ دونوں بزرگ ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے دست گیر تھے اور تحریک کے روح رواں تھے
اختتام تحریک پر امام ربانی گرفتار کئے گئے۔ مگر درحقیقت یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس تمام سرگرمی کے باوجود خداوند عالم نے نجات دلادی۔
ابھی مقدمہ پیش ہی تھا کہ عام معافی کا اعلان ہوگیا۔
تاہم چھ ماہ تک حوالات یا جیل خانہ میں رہنا پڑا۔
جب دارالعلوم دیوبند کی تحریک شروع ہوئی تو آپ اس کے سربرآوردہ

رکن تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام کے مشیر خاص تھے۔

۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات ہوئی تو امام ربانی نے فرمایا سالار قافلہ چل بسا۔ جو کسی وقت خود بھی شہید ہوتا۔ اور ہمیں بھی قربان کراتا۔

حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے بانی اعظم تھے مگر آپ نے صدارت یا اہتمام کبھی منظور نہیں فرمایا۔

وفات کے بعد حضرت حاجی رفیع الدین صاحب اہتمام پر اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز صدارت پر بدستور فائز رہے۔

البتہ حجۃ الاسلام رح کی جگہ حضرت گنگوہی رح کو سرپرست کا درجہ دیا گیا۔ لیکن یہ کوئی آئینی یا با اختیار منصب نہیں تھا۔ بلکہ تمام کارکنان مدرسہ کے عقیدتمندانہ تعلق نے حضرت گنگوہی کو سرپرست بنادیا تھا۔

بایں ہمہ اختلاف رائے کا حق تھا۔ اور ایسے موقعوں پر مجلس شوریٰ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا تھا۔

حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ثم الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے دو مثالیں پیش کی تھیں

(۱) حضرت گنگوہی رح کی رائے[1] نہ تھی کہ دارالعلوم میں فلسفہ اور منطق کا درس ہو

---

[1] حضرت گنگوہی رح نے خواب دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کی اوس عمارت میں جسکو نودرہ کہتے ہیں ایک اجتماع ہو رہا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں۔ بخر موجودات کی نظر ایک کتے پر پڑی جو نودرہ کے سامنے صحن میں بیٹھا ہوا ہے حکم ہوا اس کتے کو نکالدیا جائے حضرت گنگوہی نے منطق اور فلسفہ کو کتے کی تعبیر تصور کی (واللہ اعلم)

ایک مرتبہ تعمیل ارشاد کے لئے یہ دونوں فن خارج کردئے گئے۔ لیکن پھر ارکان شوریٰ کے کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں فنوں کو داخل نصاب کرلیا۔

شوریٰ کی اس تجویز کو نہ حضرت گنگوہیؒ کے احترام کے مخالف سمجھا گیا۔ نہ حضرت گنگوہیؒ کو کوئی کبیدگی ہوئی۔

(۴) حضرت مولانا محمد حسن صاحب (برادر خورد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز) کو ارکین شوریٰ نے مدرسہ کا طبیب مقرر کیا۔ حالانکہ حضرت گنگوہیؒ اس کے مخالف تھے۔

اس سرپرستی کا عملی پہلو یہ تھا کہ حضرت موصوف موقعہ بموقعہ دیوبند تشریف لاکر بچشم خود حالات مدرسہ کا معائنہ فرماتے۔

سرپرستی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ گنگوہ میں درس حدیث کا سلسلہ جاری تھا دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد شائقین حدیث گنگوہ حاضر ہوتے اور برکات سے مستفیض ہوتے۔

وفات سے چند سال پیشتر تک درس حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

**تاریخ وفات** ۹ رجادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ راگست ۱۹۰۵ء۔ روز جمعہ

# سیاسی ماحول

**کانگریس کی ابتدار** انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کا بھی غلام نہیں ہوتا تو دوسرے کی غلامی کب گوارہ کرسکتا ہے۔

اور اس کی فطرت ترقی پذیر ہے۔ اور صحیح روایات کے بموجب فرشتوں پر اس کی

برتری کا ہی نکتہ ہے وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی دوسرے کی برتری کو گوارہ نہیں کرتا۔ اسی طبعی اقتضا کا لحاظ فرماتے ہوئے خداوند عالم نے توحید کی ایک دلیل یہ ارشاد فرمائی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا۔ ع ۴۔ سورۂ بنی اسرائیل۔

آپ یہ فرمایئے کہ اگر خدا کے ساتھ بہت سے معبود ہوتے جیسا کہ یہ کافر کہتے ہیں تو وہ مالک عرش کی طرف راستہ ڈھونڈھتے (عرش پر قبضہ کرنے اور انقلاب پیدا کر دینے کی فکر کرتے ماتحت کب تک رہتے۔

. . . . . . . . .

انسان کو اگر غلام بنا سکتا ہے تو صرف احسان۔ الانسان عبد الاحسان

لیکن ہندوستان تقریباً ایک صدی پیشتر سے آزادی کی دولت سے محروم ہو چکا تھا اور ایک ایسی قوم کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ جو احسان کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی اغراض پر ہندوستانی دولت و راحت کو قربان کرنیکے لئے ہندوستان پر فائض ہوئی تھی۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندوستان کے کروڑہا باشندے اپنی فطرت کو فراموش کر بیٹھیں۔ چنانچہ بلا امتیاز مذہب و ملت ایک متحدہ کوشش کی گئی جو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے مشہور ہوئی۔ حریت اور آزادی کے اس مقدس جہاد میں علماء ملت کا کتنا حصہ تھا اور پھر اسکا کیا حشر ہوا۔ یہ آپ نے حصہ چہارم کے صفحات میں ملاحظہ فرمایا۔

بہر حال وہ دور ختم ہوا۔ ہندوستانیوں کو خوب کچلا گیا۔ مگر کیا اون کے جذبات بھی ختم کر دئے گئے۔ ہرگز نہیں۔ جبل گردد۔ جبل نہ گردد۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء سے صرف پانچ سال بعد ۱۸۶۳ء میں خاندان ولی اللّٰہی کے

جانشینوں یعنی سید صاحب رح کے خلفار نے آزاد سرحد پر باقاعدہ جنگ شروع کردی - جس کے مقابلہ کے لیے لارڈ الگن وائسرائے ہند کو پوری جارحانہ کرنی پڑی - اور پھر اس جہاد کی امداد کی صورتوں کو ہندوستان سے روکنے کے لیے ۱۸۶۴ء میں انبالہ کا مقدمہ ہوا - جسکا مختصر تذکرہ تیسرے حصّہ میں گذرا - اس کے بعد تحریک دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا جو مسلمانان ہند میں جذبات حریت باقی رکھنے کے لیے ایک کامیاب تحریک تھی -

حکومت ہند ان تمام جذبات سے غافل نہیں تھی - اوس کی خفیہ پولیس اون جذبات کی اطلاع بھی یقیناً دیتی رہی ہوگی - جو سب سے پہلے علاقہ بمبئی کے مرہٹوں میں نمودار ہوئے تھے - اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بموجب اون کا آرگن - مسٹر بال گنگادھر تلک "لوکمان تلک" کا اخبار کیسری تھا جسکے نتیجہ کے طور پر ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو پلیگ کمشنر "مسٹر رانڈ" اور اوس کے رفیق لفٹننٹ - ایرسٹ - کو بمبئی میں قتل کیا گیا - [1]

لیکن انقلابی تحریکات کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو نہتا کرکے زنانہ بنادیا گیا تھا - بندوق اور رائفل تو درکنار تلوار اور برچھی بلم وغیرہ کی بھی اجازت نہیں رہی تھی - دوسری جانب یورپ میں روزانہ نئے نئے آلات حرب ایجاد ہورہے تھے - اور ہندوستانیوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی تھی - کہ بندوق اور رائفل کی آواز سے بھی اون کے حواس خطا ہونے لگے

---

[1] رولٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ صفحہ ۱۵ - ۱۲

عہ ملاحظہ ہو صفحہ رپورٹ انگریزی مطبوعہ دانتی رام پریس لاہور -

بہرحال گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈس کی سرپرست اور معلم پارلیمنٹ کے لئے ضروری تھا کہ جذبات حریت کو فرو کرنے کے لئے کوئی صورت تجویز کرے۔ تشدد مناسب نہیں تھا۔ لہذا اسطے یہ کیا گیا کہ جذبات کا رخ پھیر دیا جائے۔ مندرجہ ذیل تحریر سے اس تمام بیان پر روشنی پڑتی ہے۔

لارڈ رپن کے زمانہ میں البرٹ بل کو ناکام بنانے میں انگلو انڈین اصحاب نے جو منظم کوشش کی تھی اُسے ہندوستانیوں نے بہت محسوس کیا۔ مختلف صوبوں میں چند سیاسی جماعتیں موجود تھیں ۱۸۷۶ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن بن چکی تھی۔ . . . . . . . . . . . اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں مہاجن سبھا قائم ہو چلی تھی۔ البرٹ کی ناکامی سے ان جماعتوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہر طرف سیاسی چرچا ہونے لگا۔ جس سے انگریزی خواہان ہند کو اندیشہ ہوا کہ یہ بڑھتی ہوئی بے چینی نہ معلوم کیا شکل اختیار کرے گی۔

اس لئے مسٹر۔ اے۔ او۔ ہیوم۔ پنشنر سویلین ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور انھوں نے سب سے اول ہندوستانی گریجویٹوں کو ایک چٹھی اس مضمون کی لکھی کہ اگر آپ لوگ ذاتی آسائش اور ذاتی مقاصد کو ٹھکرا کر اپنے ملک کے لئے زیادہ آزادی اور ایک بہتر اور غیر جانبدارانہ آئین حاصل نہ کر سکیں جس میں آپ لوگوں کا ہاتھ ہو تو آپ کے مخالفین صحیح ثابت ہونگے اور ہم جو آپ کے دوست ہیں غلط ثابت ہوں گے۔ اور لارڈ رپن کے اعلیٰ منصوبے

صہ ۲۹۸

لہ اس میں یہ اختیار رہتا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ انگریزوں کے مقدمات بھی طے کیا کریں۔ روشن مستقبل

جو آپ کی بھلائی کے لئے تھے بے نتیجہ اور محض خیالی رہ جائیں گے۔ اور ترقی کے تمام خیالات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آپ کو چاہیئے کہ انگریزوں کی شکایت کرنا چھوڑ دیں کہ تمام بڑے عہدوں کے دینے میں انھیں ترجیح دی جاتی ہے۔ اور یہ کہ ہندوستانی غلامی کے رستوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ جارحانہ نہیں کرتے تو اسی برتاؤ کے مستحق ہیں کہ آپ کو اس حالت میں رکھا جائے کیونکہ آپ لوگوں میں ملکی ہمدردی اور بے نفسی کی وہ صفات نہیں ہیں جو انگریزوں میں ہیں۔ جنکی وجہ سے انھیں ترجیح دی جاتی ہے۔ ان حالات میں انھیں آپ کا حاکم بنا رہنا چاہیئے۔ اور آپ کے کندھوں کو اپنے جوئے سے خوب زخمی کر دینا چاہیئے جس سے کہ آپ اس بات کو سمجھ جائیں کہ ذاتی قربانی اور بے نفسی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے آزادی اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ [1]

اس کے بعد مسٹر ہیوم اور اس زمانہ کی تمام سیاسی جماعتوں سے خط و کتابت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ دسمبر ۱۸۸۴ء میں تھوسافیکل سوسائٹی پونا کے جلسہ میں طے ہوا کہ آئندہ سال کے دسمبر میں کانگریس کا پہلا جلسہ طلب کیا جائے۔

جلسہ کے ابتدائی امور طے کرکے مسٹر ہیوم۔ لارڈ۔ ڈفرن۔ وائسرائے ہند کے پاس چند تجاویز لے کر گئے۔ جنکا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے وہ

[1] ایل ہند کا قومی ارتقاء۔ از۔ اے۔ سی۔ مزمدار صفحہ ۴۲ بحوالہ روشن مستقبل۔ صفحہ ۱۲۔ ۲۵ دسمبر ۱۲

اصلاح رسوم اور اصلاح تمدن کی انجمن قائم کریں۔ مگر لارڈ۔ ڈفرن نے انھیں حسب ذیل الفاظ میں یہ مشورہ دیا۔

اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے بطور ملک معظم کی مخالف جماعت کے کام کرتی ہو۔ چونکہ انگریزوں کو یہ علم نہیں کہ ہندوستان میں اون کی نسبت اور اون کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہوکر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اوس کا انتظام کن امور میں ناقص ہے اور اوس کی حالت کسطرح بہتر کی جاسکتی ہے [۱]۔

یہ مشورہ دیتے وقت "لارڈ ڈفرن" نے مسٹر ہیوم سے کہدیا تھا کہ جبتک وہ وائسرائے ہیں اون کے اس مشورہ کا اظہار نہ کیا جائے۔ چنانچہ اون کے چلے جانے کے بعد یہ واقعہ روشنی میں آیا۔

لارڈ ڈفرن سے معاملہ طے کرنے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے ممبروں سے گفتگو کی اور بہت سے بڑے اصحاب سے ہمدردی اور امداد کے وعدے لیے۔ اور ہندوستان واپس آکر جملہ صوبوں سے جدا جدا ڈیلیگیٹ طلب کرکے کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا اسطرح جو لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے وہ مختلف صوبوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ اور اسی لئے مسٹر ہیوم نے یہ توقع ظاہر کی تھی

---

[۱] اہل ہند کا قومی ارتقا رصفحہ ۵ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۲ – ۱۲

یہ مجلس آئندہ زمانہ میں ہندوستان کی پارلیمنٹ ہوگی۔

**سب سے پہلی تجاویز** | کانگریس کے سب سے پہلے اجلاس میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کرکے ایک قوم بنانا

(۲) اسطرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو۔ اوسکی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لئے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں۔ اور اسی طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

اوس وقت کانگریس کا تعلق حکومت سے اسقدر قریب تھا کہ مسٹر ہیوم نے دفرانسے سے یہ سفارش کی تھی کہ کوئی گورنر کانگریس کی صدارت کرے۔ مگر دفرانسے نے کہا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اظہار رائے نہ کرسکیں گے۔

سید طفیل احمد صاحب مصنف روشن مستقبل کا خیال ہے کہ اوس زمانہ میں انگریزوں کی ایک جماعت موجود تھی جو دل سے ہندوستان کی ہمدرد اور اوس کی ترقی کی خواہاں تھی۔ مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ یہ جماعت زیادہ دنوں زندہ رہ سکی اور ہندوستان کی سیاست پر ایسے انگریزوں کا غلبہ ہوگیا جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا ہندوستان کی بہبودی کو ایک لمحہ کے

ـــئے بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

بہرحال سبب کچھ بھی ہو مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اجلاس کانگریس کی پہلی تجاویز ہی کچھ انگریزوں کی مرضی کے خلاف واقع ہوئیں۔ ان میں مسٹر بیک کا ذکر خیر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو علیگڈھ کالج کے پرنسپل اور سرسید کے مزاج پر حاوی تھے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو روشن مستقبل)

اس کے بعد اگرچہ پچیس برس تک کانگریس پر رجعت پسندوں کا قبضہ رہا۔ اور ہندوستان کے جاہ طلب ور انگریز پرست افراد ہی عموماً کانگریس پر چھائے رہے مگر کانگریس کی نمبر ا اور نمبر ۲ تجویز انگریز کو ناگوار تھی۔ کیونکہ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہ ہی تھا کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"۔ چنانچہ کانگریس کی مخالفت کی مختلف صورتیں اختیار کی گئیں۔ ہندو مسلم تفرقہ اندازی کیلئے علیگڈھ کالج کو کام میں لایا گیا۔ جسکی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں ناظرین روشن مستقبل میں ملاحظہ فرمائیں۔

مختصر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق ہی وہ نقطہ تھا۔ جس پر کانگریس اور انگریز کا مقابلہ شروع ہو گیا۔

کانگریس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔"

اور انگریزی حکومت کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا۔"

ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات

سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی نظم و نسق سے یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کہ تفرقہ ڈالو اور حکمرانی کرو۔ [۱]

متحدہ قومیت کا مسئلہ آج بھی ہندو مسلمانوں کے نزدیک نہایت اجنبی۔ اور وحشتناک چیز ہے۔ اور پھر اس مسئلہ کو سرسید صاحب نے خوب خوب اُچھالکر مسلمانوں کو کانگریس سے علیٰحدہ رکھنے میں کامیاب جدوجہد صرف کی۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ظاہر کر دیا جائے کہ اس سے پیشتر کہ سرسید صاحب کے خیالات پر مسٹر بیک کا قبضہ ہو خود سرسید صاحب کے خیالات کیا تھے۔

سرسید نے فرمایا تھا۔

قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یاد رکھو! ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو۔ مسلمان۔ اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب وہ زمانہ نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں [۲]

دوسرے موقعہ پر آپ نے فرمایا۔

جسطرح آریہ قوم کے لوگ، ہندو کہلائے جاتے ہیں اُسی طرح مسلمان بھی

---

[۱] حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۳۔ [۲] مجموعہ لیکچر سرسید صفحہ ۱۶۷ روشن مستقبل صفحہ ۲۷۱ - ۱۲

ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں۔ [1]

سفر پنجاب میں ہندوؤں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ

آپ نے جو لفظ اپنے لئے ، ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں۔ کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں۔ بلکہ ہر شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھکو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے [2]

# تحریک کانگریس اور حضرت امام ربانی۔

## علمائے ملت کے رجحانات

کانگریس۔ قائم ہوئی۔ اور اسکا نظریہ واضح ہوا۔ انگریزوں کی جانب سے اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ سر سید صاحب انگریزی پالیسی کا آلہ کار بنے۔ مسلمانوں میں کانگریس کے برخلاف ہیجان پیدا کیا گیا۔ ہندو سے نفرت دلائی گئی۔ انگریز کی وفاداری کا درس دیا گیا۔ اس کے وجود کو سایہ رحمت تصور کرنے کی فرمائش کی گئی۔ یہ تھا حضرت امام ربانی کا سیاسی ماحول۔

اس زمانہ کی سیاست میں مندرجہ ذیل سوالات تنقیح طلب تھے۔

---

[1] سر سید کے آخری مضامین صفحہ ۱۶۷ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۷۔ ۱۲ [2] سفر نامہ پنجاب سر سید صفحہ ۱۳۹۔ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۷۔ ۱۲

ان کے جوابات سے حضرت امام ربانی رحمہ کے سیاسی مسلک کی توضیح ہو جائیگی

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام

(۲) کیا انگریزوں کو نکالنے کی جد و جہد ضروری ہے۔

(۳) آزادی وطن کی کیا صورت ہو۔

(۴) جانشینان ولی اللہ نے آزادی کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا۔

(۵) کیا وطنی مطالبات اور ملکی مفاد کے لئے ہندوؤں کے ساتھ کانگریس میں شرکت جائز ہے۔

(۶) یہ حضرات کانگریس کے ممبر کیوں نہیں رہے۔

# ہندوستان کی حیثیت

**نمبر ا کا جواب** سو سال کامل گذر گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے جہاد کا لائحہ عمل بنا چکے۔

تحریک حضرت سید صاحب کا تمام ہنگامہ برپا ہوا۔

ملت اسلامیہ کے ہزاروں عزیز نوجوان شہید ہوئے سیکڑوں خاندانوں کے چراغ گل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کا خونی معرکہ ہندوستان کے چپہ چپہ کو خون شہداء سے رنگین کر چکا۔ لاکھوں درخت وحشتناک پھانسیوں کا نظارہ دیکھ چکے۔

یہ سب کچھ ہو چکا مگر انگریزی فتنہ اور یورپین دجل و فریب کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق اب بھی شبہ تھا۔

چنانچہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق استفتار کیا۔

جس کے جواب میں امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا۔ جسکی اشاعت کانگریسی دزارتوں سے پہلے ناممکن رہی۔ اور جیسے ہی کانگریسی وزارت قائم ہوئی۔ تو بازار کی چلنے والی چیز تصور کرکے اسکو ایسے بزرگ نے شائع فرمایا۔ جنکا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے۔ اور پھر آخر میں شمس العماری پٹنہ کے سابق پرنسپل کا ایک صفحہ کا بے معنی فتویٰ لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

امام ربانی رح سات صفحہ کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطور نتیجہ فرماتے ہیں۔

اکنوں حال ہندرا خود غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار نصاری دریں جا بچہ قوت وغلبہ ہست۔ اگر ادنی کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا نکنید۔ ہیچ کس از امیر وغریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید صفحہ ۱۴

اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور فرمایئے کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجرا کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے۔ اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم کردے کہ مسجدوں میں جماعت نہ ادا کریں (جیساکہ کرفیو آرڈر کے زمانہ میں عموماً ہوتا ہی) تو کسی بھی امیر یا غریب کی مجال نہیں رہتی کہ مسجد میں جماعت ادا کر سکے

. . . . . . . . . . .

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں۔

بہر حال تسلط کفار بر ہندوستان

بہر حال کفار کا تسلط ہندوستان پر اس درجہ

درجہ ست کہ در ہیچ وقت کفار بر دار
حرب زیادہ ازیں نبود۔ دارائے مراسم
اسلام از مسلمانان محض باجازت ایشان
است دار مسلمان عاجز ترین رعایا۔
کسے نیست۔ ہنود را ہم رسوخ ست
مسلمانان را نیست۔ . . . . .
. . . . . . .

ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا کسی دارالحرب
پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوتا۔ اور جو
اسلامی رسومات اور شعائر مسلمان یہاں
ادا کرتے ہیں وہ صرف اونکی اجازت سے
کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز نہیں
ہنود کو بھی کسی قدر رسوخ حاصل ہے
مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔

**جواب نمبر ۲** ہندوستان جب کہ مسلمانوں کا ملک تھا۔ انگریزوں نے اوس کو غصب کیا اور دارالحرب بنایا تو انگریزوں کو نکالنا لامحالہ فرض ہوا۔ جواب نمبر ۱ کے بعد اس پر بحث کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

**جواب نمبر ۳** یعنی آزادی وطن یا انگریزوں کے اخراج کی کیا صورت ہو

بیشک یہ مسئلہ قابل غور تھا۔ اور زمانہ کی رفتار نے اس کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔

صورت یہ ہے کہ جب تک ظاہری اسباب کی بنا پر اس درجہ قوت نہ ہو کہ فتح کی امید کی جا سکے **شرعی حیثیت سے** اقدام کی اجازت نہیں دی جا سکتی اٹھارہویں صدی کے آغاز تک سرفروشوں کی کثرت سامان فتح تھی۔ لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلات حرب نے نوجوانوں اور سرفروشوں کے بجائے آلات حرب اور فراہمی سرمایہ پر فتح و شکست کو منحصر کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانیوں سے آلات حرب چھین کر اون کو فن سپہ گری سے قطعاً نابلد کر دیا گیا تھا۔

**جواب نمبر ۴** لیکن ان تمام مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے ان حضرات نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک دوسرا نقشہ جنگ تیار کیا گیا۔ "کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زیادہ سے تنظیم کرتے ہوئے دیگر ممالک سے امداد حاصل کی جائے۔ اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ اس کا مفصل ذکر سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے تذکرہ میں آئے گا (انشاء اللہ)

**جواب نمبر ۵** پانچواں نمبر یہ کہ وطنی مطالبات اور ملکی ضروریات کے لیے کانگریس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں۔

یہ وہ مسئلہ ہے جو ۱۸۸۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۹ء تک طے نہیں ہو سکا۔ اور جب تک انگریزی شہنشاہیت ہندوستان پر مسلط ہے ممکن نہیں کہ اس قسم کے مسئلے طے ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ علماء دیانتداری کے ساتھ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں مگر اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یعنی دار الحرب کو دار الاسلام پر قیاس کیا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس حیات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رہنمائی فرماتی ہے۔

ہجرت کے بعد تک مکہ معظمہ دار الحرب رہا۔ آپ کی مقدس زندگی کا بیشتر حصہ اسی دار الحرب میں گذرا۔ ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے وقت سیرت مقدسہ کا یہی حصہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

سیرت مقدسہ کی مبسوط اور مستند کتابوں پر عمیق نظر رکھنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قریش کی اندرونی رقابت نے کس طرح ظہور اسلام کے وقت قریش

کو دو گروہ میں منقسم کر دیا تھا۔ جن میں سے ایک گروہ جس کے لیڈر ابو طالب تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ حالانکہ اس کے بہت سے افراد آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔

کیا یہ غلط ہے کہ انگریز کے مقابلہ پر مسلمانان ہند کا ہندوؤں سے تعلق وہی نوعیت رکھتا ہے جو مسلمانان مکہ کا قریش کے اس گروہ کے ساتھ تھا۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی پناہ میں نہیں تھے۔ کیا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابن دغنہ کی پناہ نہیں لی۔ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی وفات کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں آئے۔ کیا اس عرصہ کے لئے قرآن پاک کے یہ احکام نہ تھے۔

(الف) اتَّبِعْ مَآ اُوحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ . . . . . . . . — تم اوس وحی کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے نازل کی جارہی ہے اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو۔

(ب) اعراض کی تفسیر دوسری آیت میں وارد ہوئی۔

(۶) اذاھم و توکل علی اللہ — ان کی ایذا رسانی کو قطع نظر کر دو اللہ پر بھروسہ رکھو

(ج) لکم دینکم ولی دین — تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

اور کیا یہ غلط ہے کہ دار الحرب کے لئے یہ تعلیمات آج تک بدستور باقی ہیں منسوخ نہیں ہوئیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ باب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ تفسیر اتقان۔ سیرت ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد وغیرہ

(مزید توضیحات کے لئے ملاحظہ ہو شرکت کانگریس کے متعلق علماء مرادآباد کا فتویٰ)

بہرحال دلائل کچھ بھی ہوں ہمیں اسوقت امام ربانی رح کا فتویٰ پیش کرنا ہے۔ دلائل پر بحث کرنا موضوع کلام سے خارج ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوس زمانہ کے حالات پر روشنی ڈالنے کے لئے استفتار کے الفاظ بھی نقل کردئے جائیں۔

تقریباً ۱۸۸۸ء میں یعنی انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے کچھ دنوں بعد علماء ہند کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات پیش کئے گئے۔

(۱) ہنود کے ساتھ معاملات دنیوی میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔

(۲) ایک جماعت قومی مسمیٰ بہ نیشنل کانگریس جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی واسطے رفع تکالیف و جلب منافع دنیوی چند سال سے قائم ہوئی ہے۔ اور انکا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مؤثر ہوں۔ اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کے لئے مضر ہوں۔ یا خلاف سرکار ہوں تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں [1]

(۳) سید احمد خان نیچری نے جو ایک جماعت ایسوسی ایشن قائم کی ہے۔ اور

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ نصرۃ الابرار صفحہ ۱۳ - مطبوعہ مطبع صحافی لاہور اچنس گنج۔ یہ رسالہ اس استفتار اور اوس کے جوابات کا مجموعہ ہے۔ جو اسی زمانہ میں طبع ہوا تھا۔ ۱۲ ع یہ فتویٰ رسالہ قائد کے کمان نمبر بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ نمبر دیگر مفید مضامین پر اور مصطفیٰ کمال کے حالات اور اوسکی تحریک کی تاریخ اور نوعیت پر مشتمل ہے۔ ہر کے ٹکٹ بھیجدینے پر کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مرادآباد سے مل سکتا ہے۔ ۱۲

اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸ اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت
میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے برخلاف ہیں
شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علیگڈھ یا بنارس
میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ اور اوسکی مدد کے واسطے جابجا۔
ایسوسی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں۔ جو شخص
اون کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اوس کے ساتھ طرح طرح کا
فساد[ع] اور فتنہ برپا کرکے اوسکو جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو
شامل ہونا۔ اور اون کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں۔ اور نیچری لوگ بدخواہ
اسلام ہیں یا نہیں۔

حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ العزیز تینوں سوالوں کے جواب میں۔
ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر ہندو و مسلمان باہم شرکت بیع و شرا و تجارت میں کرلیویں اس طرح
کہ اوس میں کوئی نقصان دین میں۔ یا خلاف شرع معاملہ کرنا۔ اور سود اور بیع فاسد
کا قصہ پیش نہ آوے جائز ہے اور مباح ہے۔ مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہئے
اگرچہ وہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے۔ یا واقع میں خیر خواہ ہو۔ مگر اوسکی شرکت مآل[ل]
اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز
نہیں بچتا۔ پس اوس کے شریک مت ہونا۔ اور ہنود سے شرکت معاملہ کرلینا۔

---

[ل] یعنی انجام کار۔ ۱۲ [ع] معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلم لیگ کا موروثی منصب ہے۔

اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو۔ یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت اور ہنود کی ترقی ہوتی ہو۔ وہ کام بھی حرام ہے جیسا کہ اُپر لکھا گیا۔ اُسی طرح پر ہے اور بس۔ صفہ ۱۹ نصرۃ الابرار۔ ۲۶ محرم ۱۳۳۸ھ

**جواب نمبر ۶** | یہ حضرات کانگریس کے ممبر کیوں نہیں رہے۔

اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام ربانی اور اسی طرح دیگر حضرات انتہا پسند تھے۔ ان کا مطمح نظر کامل حریت تھا۔ اگرچہ ملک اور قوم کے عام مفاد کے لئے آئینی جد و جہد کو بھی پسند فرماتے ہوئے شرکت کانگریس کے جواز کا فتوی دیتے رہے۔ مگر چونکہ کانگریس کا نصب العین اس وقت صرف یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت ہو۔ اس لئے اپنے واسطے شرکت کانگریس کو منظور نہیں فرمایا۔ اور حریت کاملہ کے لئے دوسرا لائحہ عمل اختیار فرمایا۔ جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا (انشاء اللہ)

## سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

تیسرے طبقہ کے دوسرے بزرگ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہیں۔ آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے سب سے زیادہ برگزیدہ اور محبوب روحانی فرزند تھے۔

**پیدائش اور تعلیم** | آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی تھے۔ جو

دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ایک مقتدر رکن تھے

ابتدا ہی سے آپ کو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سپرد کر دیا گیا تھا یعنی کامل آفتاب کی خدمت میں ایسا باکمال آئینہ پیش کر دیا گیا تھا جس نے نہ صرف نورِ آفتاب کو سمیٹا۔ بلکہ اوس کی تمام طاقتوں کا احاطہ کر لیا۔ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہی وہ آئینہ ہے جسکے تلمذ سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا یہی وہ محمود ہیں۔ جن کے اُستاذ بھی محمود تھے اور مدرسہ بھی محمود ہوا۔

اس ہلالی آئینہ نے اولاً حجۃ الاسلام کے منبع فیوض سے سینہ کو معمور کیا اور پھر دربار رشیدی کا بہترین ہیرو بنکر جملہ خصوصیات کا حامل بنا۔ اور اس طرح قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا ماہ کامل بنکر عالم میں چمکا۔

**تکمیل و تدریس** ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں آپ تحصیل علوم سے فارغ ہوئے طالب علم کے زمانہ میں بھی سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ اور اب پورے طور سے آپ تدریس میں مشغول ہو گئے۔

۱۲۹۱ھ میں حسب تجویز مجلس شوریٰ معین المدرسین بلا تنخواہ کے مقرر ہوئے اور ۱۲۹۲ھ میں باضابطہ بمشاہرہ مبلغ ۱۵؎ مدرس چہارم ہوئے [1]

**منصب صدارت** پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تھے ۱۳۰۲ھ میں آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی صدر۔

---

[1] دارالعلوم نمبر صفحہ ۶۹ –

مدرس بنائے گئے [1]

آپ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم کے مدرس سوم مقرر کئے گئے تھے۔ ہیئت اور علم ریاضی میں آپ اجتہادی شان رکھتے تھے۔[2] ۱۳۰۷ھ تک آپ صدر مدرس رہے۔ پھر حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ ۱۳۰۸ھ میں سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس مقرر کئے گئے۔[3] جس کے لئے قدرت نے آپ کو ازل سے منتخب فرمایا تھا۔

آپ نے ۱۳۳۳ھ تک دارالعلوم میں علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں چونکہ آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے تلمیذ خاص اور ہمراز رفیق تھے۔ لہذا آپ تحریک دارالعلوم دیوبند کے اصلی منشار سے بخوبی واقف تھے۔

چنانچہ آپ کی تدریس۔ خشک اور جامد زہد و تقوی کی تلقین نہیں کرتی تھی۔ بلکہ آپ کی تربیت نے ایسے حضرات کو پیدا کیا۔ جو آج آسمان سیاست کے روشن تارے مانے جاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل حضرات شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے ممتاز تلامذہ ہیں — ہندوستان کا ہر ایک مسلمان ان حضرات سے واقف ہے۔

یہ حضرات شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی اعلیٰ تربیت کا نمونہ ہیں — ان حضرات کی سیرت و سوانح تحریک دارالعلوم کے اصلی منشار کو طشت از بام

---

[1] دارالعلوم نمبر صفحہ ۴۷۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۔ [3] ایضاً صفحہ ۴۷۔

کرنے کے لئے کافی ہے۔

سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ممتاز تلامذہ

(۱) شیخ الہند ثانی۔ سیدی ومرشدی حضرت مولانا حسین احمد صاحب۔ مدظلہ العالی۔

(۲) علامہ جلیل۔ بطل حمیت حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی۔

(۳) علامۂ جلیل امام العصر۔ حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔

(۴) ابوحنیفۂ وقت۔ حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند۔

(۵) مجاہد جلیل مولانا محمد میاں صاحب۔ عرف مولانا منصور انصاری۔ مدظلہ العالی مقیم کابل۔

(۶) فخر الہند حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(۷) حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ مدظلہ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(۸) حضرت علامۃ الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب استاذ الادب و شیخ الفقہ دارالعلوم دیوبند۔

(۹) حضرت علامہ مولانا فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔

(۱۰) حضرت علامۃ الاستاذ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند۔

(۱۱) حضرت علامہ الشیخ مولانا عبدالسمیع صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

(۱۲) مفسر قرآن حضرت علامہ مولانا احمد علی صاحب۔ مہتمم انجمن خدام الدین شیرانوالہ لاہور۔

(۱۳) حضرت مولانا محمد صادق صاحب کراچی۔ وغیرہ وغیرہ۔

**تصنیف و تالیف** سلسلۂ درس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ حاشیہ ابوداؤد شریف، حاشیہ مختصر المعانی۔ ایضاح الادلہ۔ ابواب و تراجم بخاری شریف۔ جہد المقل وغیرہ وغیرہ آپ کی اعلیٰ ذکاوت کا نمونہ ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی قرآن پاک کا وہ الہامی ترجمہ ہے جسکو باتفاق علماء ہند بے نظیر اور سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ [1]

## سیاسی ماحول اور خدمات

۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات ہوئی

[1] مولوی مجید حسن صاحب مالک مدینہ اخبار بجنور نے اس کو چند بار طبع کرایا اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور ہر ایک ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہتر اور ممتاز تر رہا ہے۔ یہ ترجمہ اور اس کا حاشیہ دیگر تمام اردو کی تفاسیر سے مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے۔

اوس سے سات سال بعد کانگریس برطانیہ کی ایک وفادار جماعت کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ عام ہندوستانیوں کی جس بے چینی نے انگریز مدبرین کو کانگریس کے قیام پر مجبور کیا تھا۔ جب اوس کا تذکرہ کیا جائے تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خاندان ولی اللہی کے ان جانشینوں کے دل بھی اسی اضطراب کے گہوارہ تھے۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ علماء ملت کے مخلصانہ قلوب پراگندہ سے عموماً متنفر رہے اسی لیے اوس زمانہ کی جدوجہد منظر عام پر نہ آسکی اور آج بھی ہم اوس کے متعلق مطبوعہ حوالے نہیں پیش کر سکتے۔

**ثمرۃ التربیت کا قیام** مگر باخبر حضرات واقف ہیں کہ ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں حضرت شیخ الہند رح اور آپ کے احباب نے فضلا اور نہ ہی خواہان تحریک دار العلوم دیوبند کی ایک جماعت بنائی تھی۔ جسکا نام "ثمرۃ التربیت" تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کا پھل۔ ایک عرصہ تک اوس جماعت نے کام کیا۔ مگر پھر وہ بظاہر سست پڑ گئی۔ اور ۱۳۲۷ھ سے تیس سال بعد ایک دوسرے نام سے اوس کا ظہور ہوا جسکا تذکرہ چند سطور بعد ملاحظہ سے گذرے گا۔

**ملکی حالات** جن جذبات کی پیش بندی کے لئے کانگریس کا قیام ہوا تھا۔ اون کی بندش نہ ہو سکی بلکہ کانگریس خود ان جذبات سے متاثر ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ انگریز کے مقابلہ کے لئے سینہ تاننا شروع کر دیا اور پھر قیام کانگریس سے سات آٹھ سال بعد وہ جذبات عمل میں آنے لگے جن کے خطرات سے بچنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس انگریزوں کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی۔ صوبہ وار حالات مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

**صوبہ بمبئی** | ۱۸۹۷ء کو بمبئی میں مسٹر رانڈ۔ اور لفٹنٹ آیرسٹ قتل کر دئے گئے
یہ قتل مرہٹوں کی بیداری کا نتیجہ تھا۔ "بال گنگا دھر تلک" کا اخبار "کیسری" مرہٹوں
کا ترجمان اور تحریک کا رہنما تھا۔ اوس نے اس قتل کی بھی کچھ حمایت کی۔ چنانچہ
مسٹر تلک پر مقدمہ چلا اور ان کو سزا ہوگئی۔ مگر گورنمنٹ کے مخالف اخبارات
کی طرز تحریر میں کچھ فرق نہ واقع ہوا۔ [1]

**بنگال** | میں نریندر ناتھ دت۔ بی۔ اے۔ جو بعد میں سوامی ویکانند کے نام سے
مشہور ہوئے ۱۸۹۷ء میں میدان میں آئے اور حریت و استقلال کی طرف اپنی
قوم کو دعوت دینی شروع کردی۔ ان کا انتقال ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ تو مسٹر بریندر گھوش [2]
اور اوس کا بھائی اربندا گھوش ۱۹۰۲ء میں اس تحریک کے قائد بن گئے۔ اور تعلیم
یافتہ طبقہ میں کام شروع کردیا۔ ان حضرات کی خفیہ کوششیں اپنا کام کررہی تھیں
کہ تقسیم بنگال کا مسئلہ پیش آگیا۔

---

[1] باغیانہ تحریک کے متعلق رولٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ مطبوعہ کاشی رام پریس
لاہور۔ دسمبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۔ ۱۶ (آئندہ اس کتاب کا نام صرف "رولٹ کمیٹی کی رپورٹ"
تحریر کیا جائے گا۔ یہ تمام باب اسی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔ ۱۲۔

[2] بریندرا۔ اور اربندا دونوں بھائی تھے۔ معزز خاندان کے نونہال تھے۔ ان کے
باپ ڈاکٹر کے۔ ڈی۔ گھوش۔ گورنمنٹ میڈیکل افیسر تھے۔ اربندا نے ولایت میں
تعلیم پائی تھی۔ اور سول سروس کے آخری امتحان میں گھوڑے کی سواری کے ناقابل
ہونے کے باعث فیل ہوگیا تھا۔ ۱۲

**تقسیم بنگال** مغلیہ حکومت کے زمانہ میں بنگال۔ بہار اور اڑیسہ ایک ہی گورنر کے ماتحت رہتے تھے۔ انگریزی گورنمنٹ نے بھی یہی صورت اختیار کی۔ لیکن لارڈ کرزن وائسرائے ہند اور ان کی حکومت نے اس صورت میں نظم و نسق کی خامیاں محسوس کرتے ہوئے بنگال کو دو حصوں پر تقسیم کرنا چاہا۔ یعنی یہ کہ بہار اور اڑیسہ کو علیحدہ صوبہ بنا کر بنگال سے جدا کر دیا جائے

چنانچہ جولائی ۱۹۰۵ء میں اس کا اعلان ہوا اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ یہ تبدیلی انقلاب پسند طبقہ کو ناگوار تھی اور اس نے اوسکے نقصانات اپنی قوم کو سمجھا کر انقلاب کیلئے برانگیختہ کرنا شروع کر دیا

احتجاج کے لئے تین صورتیں تجویز کی گئیں (۱) بائیکاٹ (۲) سودیشی کی ترویج (۳) دہشت انگیزی رپورٹ رولٹ کمیٹی،

**بہار اور اڑیسہ** بنگال کی شورش کا اثر لامحالہ بہار اور اوڑیسہ پر ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو مسٹر کنگسفورڈ جج مظفرپور کے قتل کے لئے بم پھینکا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ قاتلوں نے مس کینیڈی اور مسز کینیڈی۔ دو یورپین لیڈیز کو قتل کر دیا جو جج موصوف کی گاڑی پر سوار تھیں۔

**صوبہ آسام** بھی بنگالیوں سے متصل تھا اور چونکہ اوس کے ذریعہ سے برما کی ملحق سرحدات میں بے چینی پھیلائی جا سکتی تھی۔ نیز آسام کی بندرگاہوں سے دیگر ممالک کے خفیہ اسلحہ وغیرہ کی درآمد آسانی سے ہو سکتی تھی لہذا آسام کا متاثر ہونا بھی ضرور تھا۔ چنانچہ سازش برہما کے مقدمات ان تمام امور پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

**سی پی**

صوبہ سی۔پی مرہٹوں کا قدیم سے آماجگاہ رہا ہے۔ صوبہ بمبئی سے ملحق ہے اور اس پر صوبہ بمبئی کی شورش کا اثر ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۹۰۷ء میں۔ کانگریس کے اجلاس کے لئے ناگپور تجویز کیا گیا تھا۔ مگر کانگریس کی نرم پالیسی نے ناگپور کے گرم جوش نوجوان کو اسقدر مشتعل کر دیا کہ وہاں کانگریس کا اجلاس ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ ناگپور کے بجائے اجلاس صوبہ بمبئی میں کیا گیا۔

**مدراس**

۱۹۰۷ء میں بنگال کے نوجوانوں نے مدراس میں بھی کام شروع کر دیا۔ نیز بمبئی کے مرہٹوں نے بنگالیوں کی امداد کی اور یہاں بھی وہی شورش برپا ہو گئی۔ سری نواس آئنگر کا اخبار "انڈیا" اسی سال ضبط ہوا۔ اور سری نواس کو سزا ہوئی۔ پھر ۱۹۱۱ء میں مسٹر ایش ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تناولی کو اسٹیشن پر قتل کر دیا گیا۔

**پنجاب**

پنجاب میں تحریک آزادی کی نوعیت اگرچہ کچھ مختلف تھی مگر دوسرے صوبوں سے کم نہیں تھی۔

اسی سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو ۱۹۰۷ء میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ بھائی پرمانند بھی اسی زمانہ کے انقلابی لیڈروں میں سے ہیں۔ جو ۱۹۰۷ء میں دوبارہ گرفتار کئے گئے اور سزایاب ہوئے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا۔ لارڈ موصوف بچ گئے۔ ایک اردلی مارا گیا۔ اس سازش کا مرکز بھی لاہور ہی کو قرار دیا گیا تھا۔

**صوبہ یوپی**

۱۹۰۸ء میں سازش بنارس کا مشہور کیس ہوا۔ اور دیگر اخبارات پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ یہ اس صوبے کے اضطراب کی دلیل تھی۔

مختصر یہ کہ ۱۹۰۸ء کا زمانہ وہ تھا۔ جو بقول سر ڈینزل ایٹسن لفٹنٹ گورنر پنجاب "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے" لہ

# انقلابی تحریکات کی قومی و مذہبی نوعیت

رولٹ ایکٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بموجب یہ تمام تحریکات "ہندو ازم" کے ماتحت تھیں۔

(۱) مغربی ہندوستان میں انقلابی تحریک کے آثار ابتداءً ان سالانہ میلوں میں رونما ہوئے۔ جنمیں سے ایک "گنپتی" کے اعزاز میں منعقد ہوتا تھا۔ اور دوسرا مرہٹہ سردار "سیواجی" کے اعزاز میں ؎۲

(۲) اس تحریک کا اہم نقطہ یہ تھا کہ سیواجی کے کارنامے قوم کے سامنے پیش کرکے انکو انقلاب پر آمادہ کیا جائے۔

چنانچہ سیواجی کے میلہ میں مندرجہ ذیل اشلوک پڑھا جاتا تھا۔ ؎۳

محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے ہی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے پر آمادہ ہو جائیں۔ بہر حال اے لوگو اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہئیے کہ ہم نے دشمن کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم قومی جنگ کے میدان میں اپنی زندگیوں کو

---

لہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفہ ؎۲ ایضاً صفہ ۱۱ ؎۳ ایضاً صفہ ۱۳-۱۲

جو کھوں میں ڈال دیں گے اور دشمنوں کے خون سے زمین کو سرخ کر دینگے۔ جو ہمارے مذہب کو ناپاک کر رہے ہیں۔ ہم دشمنوں کو مار کر رہیں گے اور ہم عورتوں کے مانند بیٹھے ہوئے کہانیاں سنتے رہو گے

(۳) گنپتی کے میلہ کا شلوک یہ تھا۔

افسوس تمکو اپنی حلقہ بگوشی اور محکومیت پر ذرا افسوس نہیں آتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ خودکشی کر لو۔ بد طینت لوگ قصائیوں کی مانند جلادوں کی سی بیرحمی سے گایوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔ اٹھو اور گائے ماتا کی مدد کرو۔ اوسکی تکلیفات کو دفع کرو۔ مر جاؤ مگر مرنے سے پہلے انگریزوں کو ٹھکانے لگا دو دست بھکر زمین پر بار گراں کیوں بنے ہوئے ہو۔ یہ ہندوستان ہے پھر اسپر انگریزوں کا تسلط کیوں ہے۔ [1]

(۴) ونائک ساورکر۔ آج فرقہ پرست لیڈر ہیں۔ ہندو مہا سبھا کے صدر ہیں ۱۹۰۵ء میں اون کی عمر بائیس سال تھی "جب مہاتما گمبہ گورو پرم ہنس" کی رفاقت میں انقلابی سوسائٹی قائم کر رہے تھے اور پھر انڈیا ہاؤس" لندن کے آپ مسلمہ لیڈر تھے۔ جس کے ایک ممبر نے ۱۹۰۹ء میں سر ولیم کرزن وائیلی پولیٹیکل ایڈی کانگ کو قتل کر دیا تھا۔

اگر ساورکر آج ہندو پرست لیڈر ہیں تو تعجب نہیں۔ کیونکہ اوس زمانہ میں بھی آپ کی تحریک انقلاب کا مقصد "ہندوازم" تھا۔

---

[1] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۳۔ ۱۲

(۵) انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس انقلابی جد و جہد میں صوبہ بنگال تمام صوبوں سے پیش پیش اور سارے ہندوستان کا "قائد" رہا۔ لیکن بنگال میں انقلابی تحریک کا آغاز اس طرح ہوا۔

۱۸۸۶ء میں بنگال کے مشہور سوامی رام کرشن کا انتقال ہوا۔ وہ خالص مذہبی شخص تھا۔ وہ ہندوازم کی وکالت کرتا تھا۔ مگر دوسرے مذاہب کو بھی درست مانتا تھا۔ اوس کا خیال تھا کہ تمام دیوتا نراکا پرماتما کے ظہور ہیں ...... کالی روحانی طاقت کی دیوی ہے کالی کو ہی وہ اپنی اور تمام کائنات کی ماتا تصور کرتا تھا۔....

اوس کے مرنے پر اوس کے خیالات کی اشاعت کا کام اوس کے شاگردوں نے اپنے ذمہ لیا۔ جن میں سے قابل ذکر ایک بحال اوک نوجوان نریندر ناتھ دت۔ بی۔ اے۔ ہے۔ یہ شخص بعد میں سوامی "وویکانند" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور سنیاس لینے کے بعد شگاگو کی مذہبی کانگریس میں ہندوازم کے قائم مقام کی حیثیت سے شریک ہوا........ ۱۸۹۷ء میں وہ مع اپنے چند پیروؤں کے ہندوستان واپس لوٹا۔ بہت سے ہندوؤں نے اوسکو اپنا نجات دہندہ اور اپنے مذہب کا پیغمبر تسلیم کیا۔ اوس نے رام کرشن مشن کے زیر اہتمام رفاہ عام اور مذہبی کوششوں کے مرکز قائم کئے۔ مگر اپنے گرو کی تلقین سے بہت آگے بلکہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ "ویدانت ہی دنیا کا آئندہ مذہب ہے اور گو... ہندوستان اسوقت ایک غیر ملکی حکومت کے ماتحت ہے۔ تاہم اوسے بنی نوع انسان کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے محتاط رہنا چاہیئے اور شکتی ماتا کی مدد کے بھروسہ پر آزادی حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ [1]

[1] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۵

(۶) تقسیم بنگالہ نے انقلابی تحریک کو خالص فرقہ وارانہ بنادیا۔ کیونکہ اوس سے حکومت ویدانت کا تخیل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ بنگال میں ہندو اکثریت ختم ہو رہی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم نے بنگالی ہندو کی اہمیت ہی ختم کردی تھی اور حکومت ویدانت کا دائرہ محدود کردیا تھا۔ یہی تخیل تھا جس نے بنگالی نوجوانوں کو موت پر آمادہ کردیا تھا۔ چنانچہ آج بنگال کا وزیراعظم اسے۔ کے فضل حق ہے۔

بیشک اس تقسیم نے بنگال کو مسلم اکثریت کا ایک صوبہ بنادیا۔ مگر بنگال میں ہندو مسلم منافرت بھی ہمیشہ کے لئے قائم کردی۔

(۷) یہ ہی ویدانت کی حکومت کا تخیل تھا جس نے ہندو نوجوانوں کو اسقدر متأثر کیا کہ وہ انقلابی پارٹی میں صرف ہندو کو شامل کرتے تھے اور مسلمان کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ اس انقلابی نظام کا نام انوسیلن سمتی رکھا گیا تھا۔

(۸) انوسیلن سمتی میں داخلہ کے لئے بہت سے حلف لئے جاتے تھے لیکن حلف کا طریقہ "پربانا تھ اچارجیہ" نے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

درگا پوجا سے پہلے مہیلا کی تقریب پر رامداس اور میں نے ڈھاکہ سمتی کے چند دیگر اشخاص نے "رامنہ سد ہشوتی" کالی باڑی میں پولن داس کے سامنے حلف اٹھایا۔ ہم دس بارہ آدمی تھے۔ ہم نے ابتدائی۔ آخری اور خاص حلف اٹھایا۔ اوسوقت کوئی پروہت موجود نہ تھا۔ اور یہ رسم کالی دیوی کے سامنے پانچ بجے صبح ادا کی گئی۔ پولن داس نے ایک اور پوجا کی۔ بعدازاں کاغذ پر لکھی ہوئی قسمیں پڑھی گئیں۔ اور ہم نے اون پر قائم رہنے کا وعدہ کرلیا۔ خاص حلف دینے کی رسم کالی دیوی کے روبرو بائیں گھٹنے کے بل ہوکر ہاتھ میں گیتا اور تلوار

لے ہوئے ادا کی گئی گھٹنے کے بل ہونے سے پرتیالرھا کا آسن بنتا ہے۔ جس سے شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے شخص نے اس طرح بیان کیا ہے۔

مجھے "پورن" کالی پوجا کے دن گھر سے بلا کے گیا اور ہم سب نے اُس دن فاقہ کیا۔ رات کے وقت پورن ہم سب کو شمشان بھومی میں لے گیا۔ وہاں پہلے سے کالی دیوی کے پاؤں پر دو ریوالور رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے مورتی کو ہاتھ لگایا اور قسمتی کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا۔ اسوقت سمتی کی طرف سے ہمارے نئے نام تجویز کئے گئے ۔[۱]

(۹) بظاہر پنجاب کی تحریک میں ہندو راج کا تخیل اسقدر مضبوط نہ تھا مگر تاہم اس کے لیڈر بھائی پرمانند اور لالہ لاجپت رائے تھے۔

بھائی پرمانند کے جذبات آج دنیا کے سامنے ہیں بظاہر یہ جذبات ہندو راج کی تحریک سے کم نہیں۔

(۱۰) کانگریس اس تمام دور میں کمزور رہی۔ اگرچہ ۱۹۰۶ء میں اس نے بائیکاٹ کی تصویب اور تقسیم بنگالہ کی مخالفت کی تھی۔ مگر ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ ان تمام پارٹیوں کے نصب العین کے برخلاف ہندو مسلمان کی تفریق کو گوارہ نہ کرتی تھی اور وہ ایک جماعت بنانا چاہتی تھی جو اختلاف مذاہب کے باوجود ملکی مفاد کے نقطہ پر متفق ہو کر تمام ہندوستانیوں کو ایک نیشن بنادے۔

---

[۱] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۲۶ ۔

# انقلابی جماعتوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی

"برن ہارڈی" نے اپنی کتاب جرمنی اور آئندہ جنگ" میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ بنگال کے لوگوں میں قومی اور انقلابی تحریک جاری ہے اگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے متفق ہو جائیں تو ان کی شرکت عمل سے انگلستان کا بلند درجہ جو اُسے اقوام عالم میں حاصل ہے مخدوش ہو سکتا ہے۔ ؎۱

ایک شخص مسمّی ہردیال جو کبھی دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونیورسٹی کا ایک ہندو طالب علم تھا ۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ حاصل کر کے اکسفورڈ میں تکمیل کی غرض سے انگلستان گیا اور اس نے اپنا وظیفہ اور اس کی آخری قسط واپس کر دی اور بیان کیا کہ میں انگریزی طریقہ تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ واپس آیا اور ایک انقلابی پارٹی تیار کی ؎۲

۱۹۱۱ء میں سان فرانسسکو "امریکہ" پہونچا۔ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف مقامات پر جلسے کر کے لیکچر دئیے اور ایسی انجمنیں قائم کیں جنھوں نے ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کو ختم کرنے کی قسمیں کھائیں۔ اس نے "غدر" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ جس کا پہلا پرچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا ؎۳ جو کثیر تعداد میں ہندوستان میں تقسیم ہوتا تھا۔

جس میں باغیانہ اشتعال انگیز مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ اور خفیہ

---

؎۱ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۵۹ ؎۲ ایضاً صفحہ ۱۵۸ ۔ ؎۳ ایضاً صفحہ ۲۳۷ ۔ ۱۲

انجمنوں کے بنانے کی تلقین ہوتی تھی عـــہ

اخبار کے علاوہ موقعہ بموقعہ پمفلٹ بھی شائع کئے جاتے تھے۔ مثلاً ایک
مرتبہ "غدر کی گونج" کے نام سے اشتعال انگیز نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ جسکی
ایک نظم میں تلک، لیاقت حسین، برکت اللہ، سوکی، اجیت سنگھ، ساورکر، اربندا
گھوش، کرشنا ورما، ہر دیال، وغیرہ وغیرہ کی تعریفیں کی گئیں۔

اوس کے ساتھیوں میں زیادہ قابل ذکر دو آدمی ہیں۔ ایک ہندو مسمیٰ
رام چندر۔ دوسرا مسلمان مسمیٰ برکت اللہ۔ [1]

ہر دیال نے اپنے تمام ساتھیوں کو سمجھایا کہ انگلستان پر جرمنی عنقریب حملہ
کرنے والا ہے اور یہی وقت ہے کہ ہم ہندوستان پہونچکر کام کریں [2]

ہر دیال اور اوس کے ساتھیوں کے تمام واقعات موضوع کلام سے
خارج ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ یہ پارٹی امریکہ، فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور

[1] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۳۳ [2] ایضاً صفحہ ۲۳ - ۱۲

عـــہ دلچسپی کے لئے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بہادرو جلدی کرو غدر برپا کرکے ان تمام ٹیکسوں کو بند کردو جو ہم سے وصول
کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے ایسے بہادر سپاہیوں کی جو ہندوستان میں غدر پھیلائیں
موت تنخواہ ہے شہادت انعام ہے۔ آزادی پنشن ہے۔ میدان جنگ ہندوستان
ہے۔ اٹھو آنکھیں کھولو۔ غدر کے لئے روپیوں کی تھیلیاں بھردو، ہندوستان پہونچ جاؤ
اور آزادی کے لئے جانیں قربان کردو۔ (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۳)

چین، مصر، ترکی، افغانستان وغیرہ تمام ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس پارٹی میں ہندو، مسلمان، سکھ تینوں قومیں شریک تھیں۔

ترکی اور جرمنی اس کی پشت پر تھے۔ مختلف جہازوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں رائفلیں اور سامان جنگ نیز نقد روپیہ پہونچانے کی کوشش کی گئی۔ اخبار غدر کی طرح ایک دوسرا اخبار "جہان اسلام" مئی ۱۹۱۴ء کے قریب قسطنطنیہ سے جاری کیا گیا۔ اس میں عربی، ترکی، اور اردو ہندی کے مضامین ہوتے تھے۔ اردو کا اردو حصّہ پنجاب کا ایک باشندہ ابوسعید تیار کرتا تھا جو ۱۹۱۲ء تک مدراس اور کسی زمانہ میں رنگوں میں کلرک تھا۔ اور جب ٹرکی اور اٹلی کی جنگ چھڑی تو وہ مصر چلا گیا تھا۔ اعلانؔ جنگ کے بعد اس اخبار کا اردو حصّہ ہردیال کا لکھا ہوا تھا۔ اور مصر کے نیشنلسٹ لیڈروں۔ یعنی فریدبے اور منصور عرفت نے بھی برطانیہ کے خلاف مضامین لکھے تھے۔

۲۰ رنومبر ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں انور پاشا کی ایک تقریر درج کی گئی تھی۔ جسمیں اور بہت سی باتوں کے علاوہ انور پاشا مرحوم نے یہ بھی کہا تھا کہ "ہندوستان میں غدر بپا کیا جائے۔ انگریزی اسلحہ خانوں کو تاخت و تاراج کر کے اسلحہ لوٹ لئے جائیں اور انھیں ہتھیاروں سے انگریز مار ڈالے جائیں۔ ہندوستان میں ہندوستانی بتیس کروڑ اور انگریز صرف دو لاکھ ہیں ان سبکو قتل کر دینا چاہیئے۔ ان کے پاس فوج بالکل نہیں ہے۔

---

۵ اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی (روشن مستقبل صفحہ ۳۸۱)۔

ترک نہر سویز کو عنقریب بند کرنے والے ہیں۔ لیکن وہ جو اپنے ملک و وطن کو آزاد کرنے کی کوششوں میں جان دیگا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اے ہندو اور مسلمانو تمہیں دونوں انگریزی فوجوں کے سپاہی ہو۔ تم آپس میں بھائی ہو یہ تنبیح اور کمینے انگریز تمہارے دشمن ہیں۔ تم جہاد کا اعلان کر کے غازی بن جاؤ اپنے بھائیوں کے ساتھ ملکر انگریزوں کو قتل کر دو اور ہندوستان کو نجات دلواؤ

ہردیال ستمبر ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ گیا تو ابوسعید کے پاس ٹھیرا۔

ابوسعید کی تحریرینگ ٹرکش پارٹی" کے ایک ممتاز ممبر" توفیق بے" ۱۹۱۳ء میں رنگون آئے اور رنگون کے ایک تاجر کو ترکی قنصل بنایا۔

رنگون اور برما کی داستان بھی طویل ہے، وہ موضوع بحث سے خارج اس سلسلہ میں خصوصیت سے مندرجہ ذیل حضرات کے نام لئے جاتے ہیں۔

(۱) بسابہ مجتبٰی حسن[۲] حضرت مولینا[۲] دعلی احمد صاحب تقی (۳) حکیم فہیم علی (۴)

---

[۱] رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۴۱۔ [۲] یہ بزرگ ابتک زندہ ہیں شیعہ ہیں مگر شیعت سے ناواقف، حریت کے فدائی۔ چین کے انقلاب میں حصہ لیا۔ پھر اس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ گرفتار ہوئے تو پھانسی کا حکم ہوا۔ پھر خاص خاص سفارشوں کے سبب سے عین پھانسی کی تاریخ کو حکم پہونچا کہ پھانسی منسوخ کی جائے پھر چند دفعات میں انکو ۵۴ سال کی سزا دی گئی۔ مگر جب بیس سال جیل خانے میں رہکر سارے قوی معطل ہوگئے تو اب انکو رہا کر دیا گیا۔ فیض آباد جیل میں دو مرتبہ میں تقریباً ایکسال احقر کا (باقی برصفحہ ۱۱۳)

(۴) حسن خاں

ہردیال اور ہندوستان کے دیگر انقلاب پسندوں نے ۱۹۰۵ء میں برلن میں "انجمن انقلاب ہند" بنائی اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اسکے مسلسل جلسے ہوتے رہتے تھے۔ جن میں ترک، مصری، جرمن افیسر شریک ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ ایسے جلسے ہوتے تھے جن میں جرمن اور ہندوستان کے مشترکہ مفاد پر بحث ہوتی تھی لہ

ان مسلسل واقعات اور اس پیہم جد وجہد کا نتیجہ یہ تھا کہ فروری ۱۹۱۵ء میں۔ ایک تاریخ مقرر کی گئی۔ جسمیں ہندوستان کے مختلف مقامات اور چھاونیوں پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔ مگر حسب ضرورت اسلحہ فراہم نہ ہو سکنے کے باعث یہ تاریخ ٹالی گئی اور اس کے بعد گورنمنٹ کو اسکا سراغ لگ گیا۔

مذکورہ بالا تحریر سے آپکو مندرجہ ذیل امور کا اندازہ ہو گیا۔

(۱) ۱۹۹۳ء سے ۱۹۱۵ء تک ہندوستان کی سیاست تشدد پسند تھی۔

لہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۲۶ ۔ باقی حاشیہ صفحہ

موصوف کیساتھ رہنا ہوا ہے۔ انقلاب کی زندہ تاریخ جس رہائی کے بعد گذشتہ سال کانگریس کمیٹی صوبہ یوپی کے دفتر میں ملازم ہو گئے ۱۹۳۶ء میں دفتر صوبہ میں ملاقات ہوئی ایک شعر پڑھا جو ان کی حالت کا مرقع ہے۔ نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا ۔ میں نہ دانہ ہوں مگر اک میزان سے۔ ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی بہت زیادہ قابل واقع ہوئی ہے اسکی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حکیم ہاشم علی کے دھوکہ میں شہر مرادآباد کے امام مولوی ہاشم علی صاحب کو گرفتار کر لیا جو ان زمانہ میں مصر سے واپس آرہے تھے۔ امام صاحب گورنمنٹ کے اردی وفادار ان جھگڑوں سے ناآشنا بہرحال ایک مصیبت تھی جو آگئی اور بڑی مصیبت سے نجات ملی۔

(۲) دہشت انگیزی اور تشدد کے اصول پر ہی انقلاب کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا تھا

(۳) یہ تمام جماعتیں ایک دوسرے سے منسلک تھیں

(۴) جب اس تحریک کا تعلق بیرونی ممالک سے ہوا تو اس میں ہندوستانی ہندو مسلمان سب شریک تھے۔

# تحریک شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ اللہ

(۱) پہلے گذر چکا کہ ۱۲۹۷ھ تقریباً ۱۸۷۹ء میں حضرت شیخ الہند رحمہ نے ایک جمعیۃ قائم کی تھی جسکا نام "ثمرۃ التربیت" تھا (تربیت کا پھل)

اس انجمن کا نام خود ایک عملی لائحہ کی خبر دیتا ہے۔ اور واضح کرتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام انقلابی جماعتوں سے پیشتر علماء ملت نے ایک بنیاد قائم کر دی تھی۔

(۲) پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تجویز یہ تھی کہ سرحد اور افغانستان اور ایران کی حکومتیں ایک نظریہ پر متحد ہو جائیں۔ پھر ۱۸۵۷ء سے پیشتر شاہ ایران نے بھی اسکی دعوت دی۔ حضرت شیخ الہند رحمہ کے جذبات بھی یہی تھے۔

(۳) سلاطین اسلام کے زمانہ میں کابل ہندوستان کا جزء رہا ہے۔ انگریزوں نے بھی اسکا ارادہ کیا مگر ناکام رہے۔ حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جدو جہد نے ہندوستانی اور سرحدی مجاہدین میں ایک رابطہ قائم کر دیا جو انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات کے زمانہ تک یعنی ۱۸۶۴ء تک یعنی ثمرۃ التربیت سے تقریباً پندرہ سال پیشتر تک استحکام کے ساتھ باقی رہا۔ ان مقدمات کے بعد امداد رسانی کا وہ تعلق

ختم ہوگیا۔ مگر مجاہدین کا رابطہ ختم نہیں ہوا۔ ہندوستانی مجاہدین سرحدی علاقوں میں باقی رہے۔

دارالعلوم دیوبند نے اس رابطہ کو استاذی اور شاگردی کی شکل میں تبدیل کر دیا جو انقلابی جدوجہد کے لئے پہلے سے بہت زیادہ مستحکم اور مفید ہوسکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مولانا محمود الحسن صاحب جیسا سیاسی اور مذہبی مقتدا نہ صرف استاذ بلکہ شیخ اور پیر بھی ہو۔ جسکے دست حق پرست پر سلوک و طریقت کے لئے بھی بیعت کی جاتی ہو۔ اور جہاد کے لئے بھی۔

(۴) تحریک کی تقویت کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ خود ہندوستان کے مسلمان ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں۔ اسی مبارک جذبہ نے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم۔ حکیم اجمل خاں صاحب۔ مولانا محمد علی صاحب۔ مولانا ابوالکلام صاحب جیسے مدبرین کو حضرت شیخ الہند کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا اور کوشش کی جارہی تھی کہ علوم شرقیہ اور علوم مغربیہ کی دونوں عظیم الشان یونیورسٹیوں "دارالعلوم دیوبند اور علی گڈھ کالج" میں مفاد ملت کے اصول پر آئینی اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم ہوجائے

(۵) اور جبکہ یہ تحریک نہ صرف مسلمانوں کے لئے۔ بلکہ وطن عزیز اور وطن عزیز کے تمام باشندوں کے لئے تھی تو یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی طرح برادران وطن کو بھی اس میں شریک کیا جائے، چنانچہ راجہ مہندر پرتاب اور ان کی پارٹی سے رابطہ اسی نظریہ کا عملی پہلو تھا۔

(۶) ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کا دور ہنگامہ خیز دور جس میں بقول سر ڈینزل ابٹسن لفٹنٹ گورنر پنجاب "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری

ہوئی تھی - وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ حضرت شیخ اور آپکی جماعت کے لئے ایک حیات بخش دور تھا - جسکی تمہید خفیہ طور پر ستائیس سال پیشتر سے کی جا چکی تھی - چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اسکو منظر عام پر لانیکا تہیہ کیا گیا - جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جسکی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی۔

## دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ دستاربندی

اس نظام کو عام ذہنوں تک پہونچانے کے لئے۔ مناسب سمجھا گیا کہ سب سے پہلے خالص مذہبی پیرایہ میں اسکا ظہور ہو جو اوس وقت کی سیاست کے لحاظ سے نہایت ہی مبصرانہ اقدام تھا۔

چنانچہ ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا - جسمیں ہندوستان کے اطراف و اکناف سے تقریباً تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔

یہ اجتماع اوس زمانہ تک ہندوستان کی کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا - اس لئے اس اجتماع کو اور پھر اوس سے زیادہ اوس کے حسن انتظام کو کرامت خیال کیا گیا مگر جن حضرات کی نظر اوسکی ستائیس سالہ تمہید پر تھی وہ اسپر اسقدر متعجب نہیں کرتے تھے - اگرچہ کامیابی پر بہت زیادہ مسرور تھے۔

اس تمہید ہی کی برکت تھی کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے علماء اور زعماء نے اس اجتماع میں شرکت فرمائی - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علیگڈھ کالج میں انگریزی پڑھنے جایا کریں اور علی گڈھ کے گریجویٹ عربی پڑھنے کے لئے دیوبند آیا کریں۔

یہ تجویز بہایت مبارک خیال کی گئی اگرچہ اسکا ثمرہ نہایت تلخ تھا۔

یعنی پہلی مرتبہ جو علیگڈھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ جنھوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کرکے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کر لیا [1]

## جمعیۃ الانصار کا سب سے پہلا اجلاس

جلسہ دستار بندی فضلاء دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جمعیۃ الانصار کے اجلاس کی تیاری کی گئی اور ما حضر کے جائے اقامت "شہر مراد آباد" کو یہ شرف حاصل ہے کہ جمعیۃ الانصار کا سب سے پہلا اجلاس شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء میں اسی سرزمین میں ہوا۔ اس جلسہ کا اجتماع بھی حیرت انگیز تھا اور باوجودیکہ پلیگ کی شدت تھی تاہم اجتماع بے نظیر اور انتظام قابل رشک تھا۔

## کرامت یا حسن اتفاق

پلیگ کی شدت کے باعث کلکٹر صاحب مراد آباد

---

[1] اس جلسہ میں حسن انتظام۔ برکت طعام۔ وغیرہ وغیرہ کے عینی مشاہدوں نے اس جلسہ کو کرامت قرار دیا۔ تقریباً تیس ہزار کا اجتماع تھا مگر کھانے وغیرہ کا خرچ اس قدر قلیل کہ جسکو صرف کرامت اور برکت ہی کہا جا سکتا ہے لطف یہ ہے کہ اس تمام مجمعہ کو صرف دو ڈھائی گھنٹہ میں کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ جبکہ نہ کوئی شور و شغب ہوتا تھا نہ بدنظمی اور پریشانی یہ امر بھی خلاف معمول و خلاف عادت تھا کہ تمام کیمپ، بازار، کھانا پکنے اور کھانا کھلانے گوشت بنانیکے مقامات میں حشرات اور موذی جانور گویا تھے ہی نہیں بہت مرتبہ تجسس کیا گیا مگر خیال کی تغلیط نہیں ہوئی رات بھر کیمپ میں ڈیروں سے باہر کھانا رکھا رہتا تھا مگر کوئی جانور پاس نہ آتا تھا۔ ملاحظہ ہو روئداد جلسہ ۱۳۲۹ھ

نے ان تاریخوں میں جلسہ کی ممانعت کردی تھی منتظمان جلسہ نے کلکٹر صاحب سے کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ علمار کی تشریف آوری سے پلیگ جاتا رہیگا۔

یہ عجب بات ہے کہ اس عقیدہ تمنا ری سے کلکٹر صاحب مرعوب ہوگئے اور اجازت دیدی) پھر اس سے زیادہ عجب یہ کہ علمار کی تشریف آوری ہوئی اور پلیگ بالکل ختم ہوگیا۔ ؟ فللہ الحمد

جمعیۃ الانصار کے ناظم حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی تھے آپ نے جلسہ کی رودیداد میں تحریر فرمایا تھا۔

رمضان ۱۳۲۸ھ کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی۔ جبکہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیۃ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی اور گو جمعیۃ کے وسیع مقاصد ہم غریبوں کے پیمانہ مقدرت سے زائد معلوم ہوتے تھے۔ مگر ہمارے اکابر نے اپنی عالی قدر تائید و امداد کے وعدہ کے ساتھ انکو شرف قبول بخشا۔ اور غایت شفقت سے جمعیۃ کی سرپرستی منظور فرمائی۔ جن لوگوں نے اوسوقت جمعیۃ کے بلند مقاصد پر نظر فرماکر شیخ چلی کے خیالات سے تشبیہ دی تھی۔ وہ بیشک ہماری خستہ حالی اور بے سرو سامانی کے اعتبار سے بالکل درست تھی۔ لیکن میں معاف کیا جاؤں۔ اگر یہ کہوں کہ انھوں نے ہمارے بزرگوں کی ہمت و اخلاص اور توجہ الی اللہ کا ہرگز کافی طور پر اندازہ نہ کیا تھا۔ [1]

---

[1] رسالہ القاسم بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ صفحہ ۵۔

اس جلسہ کے صدر حضرت مولانا احمد حسنؒ صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز تھے آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے۔ لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس برس پہلے شروع ہو گئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور آفتاب فنون ہیں اور جنکی ذات بابرکات پر آج زمانہ جسقدر ناز کرے بجا ہے

لیکن یہ تحریک اوسوقت ضروریات زمانہ سے متعلق نہ تھی اسلئے رک گئی اور اب اس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے ۱۳۲۷ھ سے اس انجمن کو پھر دوبارہ

---

۱؎ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے نہایت محبوب شاگرد تھے تبحر علمی میں حجۃ الاسلام کے صحیح جانشین مانے جاتے تھے سیاسی خیالات میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے رفیق تھے مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی۔

۲؎ اکابر سے موثق طور پر سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے اس تحریک سے پیشتر حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوری۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو جمع کر کے زمانہ کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے تو ضعف قلب کا عذر کر کے معذرت کر دی اور باقی سب حضرات نے موافقت فرمائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

زمانہ کہ کے جمعیۃ الانصار نام رکھا گیا۔ جمعیۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اسکا تعلق ہے۔ بلکہ اسکے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جنکی آج کل بہت کچھ ضرورت ہے (الفاظ کی جامعیت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ یہی ہیں وہ علمار جنکو کہا جاتا ہے کہ سیاست کیا جانیں)

جلسہ انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ مگر اس نے انگریزوں کو چونکا دیا کیونکہ اس وقت تک ہندوستان اس قسم کے جلسوں سے ناآشنا تھا۔

**حضرت شیخ الہند کی سیاسی پارٹی۔**

اگرچہ جلسہ میں حکومت کا شکریہ بھی تجویز کی شکل میں پیش کیا گیا۔ مگر انگریز کی بدگمانی دور نہ ہوئی۔

ہندوستان کے دیگر زعمار مثلاً ڈاکٹر انصاری۔ حکیم اجمل خاں۔ نواب وقار الملک مولانا محمد علی صاحب مرحوم۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ حضرت شیخ الہند سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر انصاری تو باقاعدہ حضرت شیخ سے بیعت تھے۔

۱۹۱۲ء میں دنیائے اسلام پر ایک نئی مصیبت آئی۔ جبکہ بلقان کی ریاستوں کو شاطر برطانیہ اور اسکی ہمنوا حکومتوں نے ترکوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ اور بلغاریوں کے ذریعہ سے ترکوں کے مقابلہ پر وہی کرانا چاہا جو جرمنی اور اٹلی نے اسپین میں جنرل فرانکو کے ذریعہ سے جمہوری حکومت کے مقابلہ میں کرایا۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کیلئے مسجد کو شہید کرا دیا۔ مسلمانوں نے مسجد کی حمایت میں اپنے سینے پیش کر دئے جو ظلم پرور فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

ان دونوں ہنگاموں نے حامیان ملت کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا۔ آزاد حکومت کے قیام کی جدوجہد تیزی سے جاری ہوگئی۔ اور دہلی میں "نظارۃ المعارف" قائم کر کے

نوجوانان ہند کو درس سیاست دیا جانے لگا۔

اس موقعہ پر حضرت مولانا عبیداللہ[1] صاحب سندھی کے بیان کے چند فقرے حضرت شیخ الہند رحمہ کے کارناموں کا نشان بتاتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل کا غالباً ابھی وقت نہیں آیا۔ حضرت سندھی فرماتے ہیں۔

سنہ ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سنکر دیوبند رہکر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی[2] میرے ساتھ شریک تھے۔ پھر حضرت شیخ الہند رح کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں "نظارۃ المعارف" قائم ہوئی۔ اسکی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند رحمہ کے ساتھ حکیم اجمل خاں۔ اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔

حضرت شیخ الہند رح نے جسطرح چار سال دیوبند میں رکھکر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیجکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا

[1] مولانا سندھی نے اپنے حالات مختصر طور پر پریس کو دئے تھے جو اخبار الجمعیۃ وغیرہ میں۔ شائع ہوئے۔ پھر رسالہ قائد مراد آباد بابت ماہ ربیع الاول میں شائع ہوئے۔ ۱۲۔

[2] مولانا احمد علی صاحب مفسر۔ مہتمم انجمن خدام الدین لاہور۔ ۱۲

ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا اسطرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔

۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کیلئے جانا ضروری تھا خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہونچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتا سکے۔

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اسکی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کیلئے تیار ہے۔ اسمیں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ [1]

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ العالی نے "سفرنامہ شیخ الہند" اسیر مالٹا" میں تحریر فرمایا ہے۔ بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بیچین کن اثر ڈالا۔ چنانچہ اسوقت حسب طریقہ استاذ اکبر مولانا

[1] کانگریسی وزارت کا طفیل ہے کہ اس کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے اور ضبطی کا خطرہ سامنے نہیں۔ مگر حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت کے سلسلہ میں اس سے زیادہ توضیح نہ مولانا سندھی مدظلہ العالی نے مناسب سمجھی۔ نہ ہم کر سکتے ہیں۔ خط کشیدہ جملے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ۱۲

محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز دبزمانہ جنگ روس امولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے۔ مدرسہ کو بند کر دیا۔ طلبہ کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دیکر ایک اچھی مقدار بھجوائی مگر اسپر بھی چین نہ پڑا کیونکہ جنگ بلقان کے نتیجہ نے دردمندوں کو بالکل غیر مطمئن کر دیا تھا۔ اور بتا دیا تھا کہ یورپ کے سفید عفریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ پھر نمتہ داران برطانیہ مسٹر اسکوئتھ وغیرہ کی روباہ بازیاں خرس روس کی جفاکاریاں تو یقین دلاتی تھیں کہ تقسیم ترکی، اور اجرائے وصایا گلیڈسٹون کا زمانہ سر پر ہی آگیا ہے [1]

الحاصل مولانا نے تھوڑی مدت میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر لی۔ اور کام کرنے والوں کیلئے شاہراہ عمل قائم کر دی اصحاب دل اور اہل درد خوشی خوشی مولانا کے ہمراز ہو گئے اور علاوہ اس کے اور بھی بہت سے کام ہو گئے۔ اسی اثنار میں فلک نے نیا گل کھلایا اور جنگ عمومی کی تیرہ و تار بنیاد پڑ گئی۔ سارے عالم میں خون کے فوارے پھوٹ نکلے۔ بستیاں کی بستیاں برباد ہونے لگیں بحر و بر میں فتنہ و فساد پھیل گیا

**گورنمنٹ پرستوں کا فتنہ**

وہی ترکی جسکو انگریزوں نے اپنی ضرورت کیوقت ہندوستانی مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیا تھا۔ اور خلافت عثمانیہ کا شاندار تعارف کرا کر خلیفۃ المسلمین سے برطانیہ کی دوستی کا اعلان کرایا تھا۔ اور اسطرح ہندوستانیوں کو سلطان ٹیپو وغیرہ سے علیحدہ کر کے اپنا غلام بنایا تھا۔ اب وہی ترک چونکہ میدان جنگ میں انگریز کے مقابلہ پر تھا۔ تو اوسکو فاسق فاجر قرار دیکر خلافت کا غیر مستحق گردانا۔ گورنمنٹ پرست مولویوں نے

[1] سفرنامہ شیخ الہند صفحہ ۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۲

فتویٰ مرتب کیا۔ مولوی عبدالحق حقانی اس فتوے کے موجد اور مؤلف تھے۔ حضرت مولانا کی خدمت میں یہ فتویٰ دو مرتبہ پیش کیا گیا۔ حضرت موصوف نے سختی سے رد کر دیا اور جن لوگوں نے اسکی تصدیق کی تھی اون کے متعلق بھی سخت کلمات کہے مجمعہ عام میں اوسکو پھینکدیا

**سفرحجاز** حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کو افغانستان اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لئے پہلے سے بھیجا جاچکا تھا اور اسطرح تحریک کا رابطہ براہ راست امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان سے قائم ہو چکا تھا۔ لیکن انقلابی جدوجہد کیلئے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات کا قائم کرنا بھی ضروری تھا۔

علاوہ ازیں مولانا محمد علی صاحب وغیرہ کو حکومت ہند نظر بند کر چکی تھی اور حضرت شیخ الہند کے متعلق بھی یہی منصوبے ہورہے تھے کہ آینوالا تحریک انقلابی مقاصد کیلئے سفر ہوتا اسلئے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ جسکے لئے شوال ۱۳۳۳ھ میں دیوبند سے روانہ ہو گئے۔

**روانگی حجاز** عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازیپوری برادر بزرگ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم نے اس سفر میں بہت زیادہ مدد دی۔ حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہونچ گئے۔ جائے قیام ٹکٹ۔ اور ہر قسم کا سامان سفر نہایت فراخدلی سے مہیا کر دیا۔

**رفقاء سفر** مولانا کی روانگی معمولی روانگی نہ تھی۔ بہت سے حقیقی اور مصنوعی ارباب عقیدت ساتھ ہو گئے۔ جنمیں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔ مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی۔ مولانا عزیز گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری۔ حاجی خان محمد صاحب

مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی۔ حاجی محبوب خاں صاحب سہارنپوری ۔
حاجی عبدالکریم صاحب سروجی۔ مولانا وحید احمد صاحب رحمۃ اللہ مدنی

**خفیہ پولیس** افواہ گرم ہوئی کہ حضرت مولانا کے ساتھ سات ۔ آٹھ سی ۔ آئی ۔ ڈی جہاز میں چل رہے ہیں اسکی اطلاع شدہ شدہ ترکی پولیس تک پہونچ گئی ۔ چنانچہ مشتبہ حضرات حراست میں لے لئے گئے اور اسی طرح زیر حراست انکو رج کرایا گیا [۱]

**وارنٹ گرفتاری** حکام بمبئی کو بذریعہ تار گرفتاری کا حکم دیا گیا مگر کثرت اجتماع کے باعث پولیس کی ہمت نہ پڑی ۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا مگر یہ تار اوس وقت ملا جبکہ حضرت شیخ الہند "جزیرۂ سعد" میں قرنطینہ کے لئے اتر چکے تھے [۲]

**داخلہ مکہ معظمہ** ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کی شام کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ۔

**غالب پاشا سے ملاقات** غالب پاشا مکہ معظمہ کے گورنر تھے مکہ معظمہ پہونچکر حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے پاشا موصوف سے ملاقات فرمائی اور اپنی تجویز اور اسکے متعلق کامیابی کی رودادپیش فرماکر امداد کا مطالبہ کیا ۔ غالب پاشا کو پیشتر سے حضرت شیخ سے تعارف کرایا جا چکا تھا ۔

غالب پاشا نے حضرت شیخ کو چند مکتوب عنایت فرمائے ۔ جنمیں سے ایک مکتوب "بصری پاشا" گورنر مدینہ طیبہ کے نام تھا ۔ جسمیں فرمائش کی تھی کہ حضرت شیخ کی ملاقات انور پاشا اور جمال پاشا سے کرادیں ۔

اسکے علاوہ استنبول وغیرہ کے حکام اور دیگر ارکان حکومت کے نام بھی غالب پاشا ۔

---

[۱] سفرنامہ شیخ الہند صفحہ ۔ [۲] ایضاً صفحہ ۔ [۳] ایضاً صفحہ

ے خطوط لکھکر حضرت شیخ کو دئے تھے۔

حضرت شیخ مدینہ طیبہ پہونچے۔ بصری پاشا سے ملاقات فرمائی۔ غالب پاشا کا مکتوب بصری پاشا کو دیا۔ بصری پاشا نے انور پاشا کو بلانے کا وعدہ کیا۔

**ایک بھولے بھالے بزرگ** حضرت شیخ کے پرانے دوستوں میں سے ایک صاحب اسی سال حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ صاحب باوجودیکہ ایک پاک باز زاہد اور نیک نفس عالم تھے مگر سیاست سے بیگانہ اور اہل زمانہ کی چالاکیوں سے بیخبر یہ صاحب حضرت شیخ الہند کے ہمراہ مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ انکے علمی تبحر، سادگی اور نیک نفسی کی بنا پر حضرت شیخ انکا احترام فرماتے تھے۔

بدقسمتی سے پنجاب کے کچھ لوگ جو بظاہر بہت نیک تھے۔ مگر درحقیقت یہ گورنمنٹ برطانیہ کے فرستادہ تھے۔ مدینہ طیبہ کی پولیس کو ان پر شبہ ہوا اور انکو گرفتار کر لیا۔ چونکہ بزرگ صاحب موصوف انکی ظاہری دیانت سے متاثر تھے لہذا حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو بزرگ صاحب نے مجبور کیا کہ بصری پاشا گورنر مدینہ طیبہ سے انکی سفارش کریں۔ مولانا حسین احمد صاحب نے بہت کچھ معذرت کی۔ مگر آخرکار مجبور ہو کر ان گرفتاریوں کے متعلق بصری پاشا سے ملاقات فرمائی۔

گورنر صاحب نے سفارش منظور فرمائی اور خاص احتیاط کیساتھ ان لوگوں کی رہائی کا حکم فرما دیا لیکن یہ رہائی پولیس کمشنر کی مرضی کے خلاف تھی اور اسکو اس سفارش سے شکایت پیدا ہو گئی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بصری پاشا انور پاشا کو دعوت دینے میں پس و پیش کرتا رہا۔

ابن شیر خدا مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے ہمراہ تھے

آپکے طویل و عریض خطوط جو اردو زبان میں ہوتے تھے۔ سنسر میں پکڑے گئے۔ جن سے پولیس افسران کی بدگمانی ان حضرات کے متعلق اور بھی زیادہ ہوگئی۔

"انور پاشا" وزیر جنگ کی حیثیت رکھتے تھے اور جمال پاشا جنوبی اور غربی محاذ یعنی سویز۔ سینا اور حجاز کے کمانڈر تھے۔

## انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات

"بصری پاشا" گورنر مدینہ طیبہ انور پاشا کو دعوت دینے میں ہنوز پس و پیش کر رہے تھے کہ جنگی ضرورتوں کی بنا پر خود انور پاشا اور جمال پاشا کو "مدینہ طیبہ" حاضر ہونا پڑا۔

(ان حضرات کا مدینہ طیبہ میں حاضر ہونا۔ دربار رسالت پناہ میں عجز و انکساری اہل مدینہ اور اہل مکہ پر انعامات کی بارش۔ ان حضرات کی مذہبیت۔ للہیت، وغیرہ کی تفصیلات سفرنامہ شیخ الہند میں ملاحظہ فرمائی جاویں۔)

سفرنامہ شیخ الہند میں اگرچہ اس موقعہ پر حضرت شیخ کی خصوصی ملاقات سے انکار کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے انور پاشا اور جمال پاشا مرحوم سے ملاقات فرمائی تمام نقشہ سمجھایا۔

انور پاشا اس چیز کے پہلے سے متمنی تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ سے امداد کا وعدہ فرمایا۔ اور چند وثیقہ تحریر کر کے حضرت شیخ کو دئے۔ جس میں آزاد قبائل کے باشندگان کو امداد کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

انور پاشا کی رائے تھی کہ حضرت شیخ آزاد قبائل میں بنفس نفیس پہونچیں۔ لیکن حضرت شیخ کی خواہش یہ تھی کہ بحری راستہ سے ہندوستان ہوکر آپ آزاد قبائل میں نہ پہونچیں آپنے خشکی کے راستہ سے سفر فرمانے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ لیکن چونکہ

ایران میں انگریزی فوجیں اُس زمانہ میں پہونچی ہوئی تھیں اسوجہ سے انور پاشا نے اس راستہ کو خطرناک قرار دیا اور طے یہ ہوا کہ اطراف بغداد سے بحری راستہ سے روانہ ہوکر مکران ہوتے ہوئے حضرت شیخ آزاد قبائل میں پہونچیں۔ اور اپنے پہونچنے سے پہلے انور پاشا کا تحریر فرمودہ وثیقہ آزاد قبائل میں پہونچادیں۔

اس سفارت کے لئے مولانا ہادی حسن صاحب کو منتخب کیا گیا اور ایک صندوق کی دیوار کے تختوں میں سوراخ کرکے وثیقہ کو اوسمیں رکھدیا گیا۔ اور تختہ کو دونوں طرف سے ہموار کردیا گیا۔

مولانا ہادی حسن صاحب بمبئی پہونچے تو نہایت سختی کے ساتھ انکی تلاشی لی گئی مگر کوئی چیز برآمد نہ ہوئی جب مکان پہونچے تو وثیقہ صندوق سے نکال لیا گیا۔ اور وہ کپڑے جو اوس بکس میں تھے دوسرے میں رکھدئے گئے۔ پولیس کو دوبارہ اوس وثیقہ کے متعلق کچھ اطلاعات پہونچیں۔ چنانچہ مکان پر چھاپا مارا کپڑوں کے بکس کو خوب ٹٹولا اور توڑ کر ریزہ ریزہ کردیا مگر نہ اب وہ بکس تھا اور نہ بکس میں وثیقہ تھا۔ بلکہ وثیقہ ایک واسکٹ کی جیب میں رکھکر واسکٹ دالان میں سامنے کھونٹی پر ٹانگدی گئی تھی۔ جسکی طرف پولیس کا خیال بھی نہ گیا اور وثیقہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی جگہ پہونچادیا گیا۔

سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز انور پاشا کے مشورے کے مطابق بحری راستہ سے سفر کا ارادہ فرمارہے تھے کہ حالات نے تبدیلی شروع کی۔ حضرت شیخ نے ارادہ فرمایا کہ غالب پاشا گورنر مکہ معظمہ سے ملاقات فرماکر استنبول پہونچیں اور اپنی اسکیم کو کامیاب کرنے کی صورت نکالیں۔ چنانچہ ۱۲ ؍ ۱۳ ؍ جمادی الثانیہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کو آپ اپنے

اپنے رفقاء کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔

## حضرت شیخ الہند کی مدینہ طیبہ سے روانگی

پہلے گذر چکا ہے کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے شوق میں ۱۲ یا ۱۳ ارجمادی الثانی ۱۳۳۴ھ کو حضرت شیخ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ پھر مکہ معظمہ پہونچکر ۲ رجب ۱۳۳۴ھ کو غالب پاشا سے ملاقات کرنے کے لئے آپ طائف تشریف لے گئے۔ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد آپکا ارادہ استنبول تشریف لیجانے کا تھا۔ لیکن دشواری یہ ہوئی کہ شتربان ایک ہفتہ کی مہلت لیکر جاچکا تھا۔ کوئی اور سواری دستیاب نہ ہوئی۔ حضرت شیخ نے دو تین روز بعد دوبارہ تاکید فرمائی مگر اب بھی سواری مہیا نہ ہوسکی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سفرنامہ میں تحریر فرماتے ہیں ہم اسوقت نہ سمجھ سکے کہ اس قدر تقاضہ کیوں ہے۔ مگر دو تین روز بعد ہی معلوم ہوا کہ طائف دشمنوں کے محاصرہ میں ہے۔ گویا حضرت شیخ کی کشفی نگاہ نے ان واقعات کو دیکھ لیا تھا جنکو ہم نہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر چونکہ اخفار کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ نیز مقام رضا میں قدم راسخ تھا، لہٰذا دو چار مرتبہ سواری کی تلاش کرنے کا تقاضہ کرکے خاموش ہوگئے۔

## عربوں کو کسطرح باغی بنایا گیا

کرنل لارنس کی تمام تبلیغ۔ شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے خفیہ معاہدوں کے باوجود غالب اہم باشندگان حجاز ترکوں سے بغاوت پر آمادہ نہیں تھے تو انکو باغی بنانے کے لئے ایک نہایت وحشتناک اور انسانیت سوز طریقہ استعمال کیا گیا۔ اسکی تفصیل شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کے الفاظ میں یہ ہے۔

دراغلہ ممالک حجاز سے بند کر دیا گیا اوائل ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں اخیر جہاز پہونچا اوسکے بعد

غلہ کی آمد ممالک مجاورت سے بند کردی گئی۔ جسکی وجہ سے سخت گرانی ہوگئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اہل ہند کے سخت مطالبہ پر ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ میں کلکتہ سے غیروزی آگ بوٹ۔ چاول وغیرہ کے چند ہزار بورے لیکر روانہ ہوا اوسکو جبراً عدن میں خالی کرا لیا گیا اور وہ غلہ جدہ میں اسوقت پہونچا جبکہ ترکی حکومت کا اثر بالکل اٹھ گیا تھا۔

(۱۰) اوسی زمانہ میں بادبانی جہاز جو کہ بحر احمر میں افریقہ کے سواحل سے غلہ لاکر جدہ، مکہ اور حجاز کے اہالی کو پہونچاتے تھے اور لوگوں کو بھوک سے مرنے کے محافظ ہوتے تھے۔ انگریزی جنگی جہازوں نے ڈبونا اور لوگوں کو قید کرنا اور غلہ چھینا شروع کیا اور اسی طرح بہت سے بادبانی جہاز اہل عرب کے غارت کردیئے گئے۔ جسکی وجہ سے غلہ کی آمد بالکل بند ہوگئی اور لوگ بہت زیادہ پریشان ہوگئے (صفحہ ۲۴ رسالہ ترک موالات)

(۱۱) دو برس سے زیادہ مدینہ منورہ محصور رکھا گیا۔ راستے بالکل بند کردیئے گئے۔ ریل کی پٹری ڈائنامنٹ کے گولوں کے ذریعہ سے اڑادی گئی۔ غلہ بند کردینے کی وجہ سے مستند شہادت لوگوں نیز ہوئی کہ ہزاروں آدمی بھوک سے مرگئے۔ قبروں سے مردوں کو نکالکر لوگوں نے اونکا گوشت کھایا۔ اور طرح طرح کے ناگفتنی آلام اٹھانے پڑے (صفحہ ۲۴ رسالہ ترک موالات)

(ل) الف پر باغیوں کا حملہ | پہلے گذر چکا ہے کہ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد حضرت شیخ جلد از جلد روانگی کا ارادہ فرمارہے ہیں مگر سواری مہیا نہ ہونیکے باعث چند روز طائف میں رکنا پڑا۔ لیکن نیرنگی زمانہ نے دوسرا گل کھلادیا۔ جسکی تفصیل یہ ہے۔ کہ ۱۱ شعبان ۱۳۳۴ھ کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے زیر کمان عبداللہ بیگ طائف پر چڑھائی کی لیکن شریف کی فوج میں عموماً غیر منظم بدو تھے۔ جنکو ترکی فوج کے معمولی دستے نے پسپا کردیا۔

اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں بھی واقعہ پیش آچکا تھا کیونکہ شریف کا انتظام یہ تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ بغاوت ہو۔

جنگ چھڑ جانے سے آمد و رفت بند ہوگئی۔ میوے، غلے اور ترکاریاں سب بند ہوگئیں۔ شب و روز گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ترکوں کی مختصر سی جماعت شریف کی کثیر تعداد اور جرار سامان جنگ سے مسلح فوجوں کو تباہ کرتی رہی۔ نصف رمضان تک یہی حالت جاری رہی لیکن جب جدہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انگریز کی مصری فوجیں مکہ معظمہ عہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں سے فتح کرتے ہوئے طائف پہونچیں اور طائف کے چاروں طرف توپیں نصب کر کے گولہ باری شروع کی گئی رمضان المبارک کا سارا مہینہ اسی خوف و ہراس اضطراب اور بے چینی میں گذرا خاص عید کے دن بھی انگریزی اور شریف کی فوجوں نے مہلت نہیں دی۔ مسجد ابن عباس رضی اللہ عنہما جو طایف شریف کی سب سے بڑی مسجد ہے اور کہیں بھی نماز و تراویح صرف الم ترکیف سے ہوتی تھی اور کبھی کبھی گولیوں کی بوچھار اتنی مہلت بھی نہ دیتی تھی۔ لیکن اب طائف میں غلہ ختم ہوچکا تھا۔ لوگ فاقوں سے تنگ آگئے تھے مجبوراً ترکوں سے نجات کی درخواست کی۔ چنانچہ ان کو نکلنے کی اجازت دی گئی۔

۶ شوال ۱۳۳۴ھ کو حضرت شیخ بھی مع اپنے تینوں رفقاء کے طائف سے روانہ ہو کر ۱۰ شوال کو مکہ معظمہ پہونچے۔ آپکا ارادہ یہی تھا کہ کسی صورت سے آپ استنبول پہونچ جائیں۔

---

عہ مکہ معظمہ یعنی خداوند عالم کے حرم پاک میں جس بیرحمی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا گیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے۔ گرمیوں کی شدت تھی ترکوں نے روزے رکھکر بے نظیر ہمت اور شجاعت سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ جب شکست کھا کر گرفتار ہوئے تو ان کی تمنا تھی کہ روزے کی حالت میں وہ ذبح کئے جائیں مگر زبردستی اولاً ان کے حلق میں پانی ڈالا گیا اور پھر ان کو حرم پاک میں ذبح کیا گیا۔

لیکن افسوس تقدیر تدبیر پر غالب آئی آپ اسی مقصد سے جدہ تشریف لے گئے چونکہ مولانا خلیل احمد صاحب مکہ کی بدامنی کی وجہ سے مجبور ہو کر ہندوستان کیلئے روانہ ہو چکے تھے۔ اور جہاز کی تلاش میں جدہ میں مقیم تھے۔ تو حضرت شیخ کے اس سفر کا دوسرا مقصد مولانا سے ملاقات کرنا بھی تھا۔ بہر حال حضرت شیخ نے تقریباً دو ہفتہ جدہ قیام فرمایا پھر مجبوراً مکہ واپس ہو

اس سال ایک سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر مسمیٰ بہار الدین خاص طور پر مکہ معظمہ بھیجا گیا تاکہ حضرت شیخ کی نقل و حرکت کی تفتیش کرتا رہے۔

## خان بہادر مبارک علی اور انگریزی اور ترکوں کی تکفیر کا فتویٰ۔

شریف حسین کی بغاوت کے برخلاف جو بےچینی عام طور پر ہندوستان میں تھی اوسکو فرو کرنے کیلئے حکومت ہند نے تجویز کیا کہ خان بہادر صاحب موصوف کو خفیہ طور سے مکہ معظمہ بھیجکر ایک فتویٰ منگایا جائے۔ چنانچہ شریف کے ہمدرد علماء کی امداد سے خان بہادر صاحب نے ایک استفتاء اور اوسکا جواب مرتب کرایا۔ جسمیں ترکی قوم کی مطلقاً تکفیر تھی۔ سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا! ور شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا۔ بہت سے شریفی علماء نے اوسپر دستخط بھی کر دئے تھے لیکن علماء کی کثیر تعداد متردد اور خائف تھی۔ حضرت شیخ کے سامنے یہ فتویٰ پیش کیا گیا تو حضرت موصوف نے سختی سے انکار فرمایا۔

آپکے انکار پر تمام حق پرست علماء کی ہمت بلند ہو گئی۔ جو حضرات متردد اور خائف تھے اون سب نے دستخط سے انکار کر دیا۔

## گرفتاریاں

اس استفتاء کا ایک مقصود یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے جذبات کو فرو کیا جائے مگر اہم مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کو اس بہانہ سے شریف سے طلب کیا جا کر

گورنمنٹ کی یہ چال کامیاب رہی۔ شریف حسین اور اوسکے شیخ الاسلام اور بقیہ علماُ وغیرہ کے دل میں حضرت شیخ کی جانب سے عناد پیدا ہوگیا کہ آپ ہم لوگوں کو باغی اور خارجی کہتے ہیں۔

فتوے پر دستخط سے انکار کرنے کے بعد یقین ہوگیا تھا کہ شریف حسین اب کوئی الزام لگاکر گرفتار کریگا۔ یا انگریزوں کے حوالہ کردیگا۔ چنانچہ ارادہ کیا تھا کہ شریف کی قلمرو سے باہر چلے جائیں۔ مگر سواری وغیرہ میسر نہ آسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے ان حضرات کو شریف سے طلب کیا۔ اور شریف نے گرفتاری کے احکام جاری کردئے

حضرت شیخ کی راحت کی خاطر حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے شیخ الاسلام سے معافی بھی چاہی۔ مگر سب بے سود رہی۔

رفقاء حضرت شیخ نے اولاً طے کیا کہ حضرت شیخ اور مولانا وحید احمد صاحب کو کہیں چھپا دیا جائے پھر خفیہ طور سے کہیں باہر بھیجدیا جائیگا۔ باقی اور حضرات کو اگر گرفتار بھی کیا گیا تو کچھ دنوں بعد چھوڑ دئے جائیں گے۔ چنانچہ اسپر عمل بھی کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔

**حضرت مولانا حسین احمد صاحبکی گرفتاری** سب سے پہلے حضرت موصوف کو کوتوالی طلب کیا گیا اور انگریزوں کو برا کہنے کے جرم میں قید کردیا گیا۔

**انگریز سے نئی دوستی ہے اوسکی مخالفت نہیں کرسکتے** حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے متعلق خبریں شہر میں گشت کرنے لگیں تو دہلی کے تاجر صاحبان شریف کے پاس پہونچے اور رحم کی درخواست کی مگر شریف نے جواب دیا کہ

ہماری اور انگریز کی دوستی نئی ہے۔ ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ضروری ہے ہم نہیں چاہتے کہ اوسمیں رخنہ پیدا ہو۔

**حاضر کرو ورنہ گولی سے اڑادیئے جاؤ گے۔**

۱۰ صفر۔ دوشنبہ ۱۳۳۵ھ کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا وحید احمد صاحب، چھپا دیئے گئے۔ مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب سامنے ہیں ان دونوں سے حضرت شیخ کا پتہ دریافت کیا گیا۔ ان حضرات نے لاعلمی ظاہر کی تو گرفتار کر لئے گئے۔ شام تک پولیس نے سب جگہ حضرت شیخ الہند کو تلاش کیا مگر ناکام رہی۔

**گولی سے اڑادو اور کوڑے لگواؤ**

مغرب کے بعد شریف نے حکم دیا کہ اگر عشا تک مولانا محمود الحسن صاحب حاضر نہ ہوں تو ان کے دونوں رفیق (مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب) کو گولی سے اڑادو۔ ان کے متوسلین کی مطوفیت چھین لو اور سو کوڑے لگاؤ۔

حضرت شیخ الہند رح کو اس خبر کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ مجھے گوارا نہیں کہ میرے باعث میرے کسی دوست کا بال بیکا ہو۔

چنانچہ عشاء کے قریب حضرت شیخ خود تشریف لے آئے احباب نے اصرار کیا کہ احرام باندھ لیجئے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ احرام باندھنے کیلئے حرم سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ فوراً اونٹ حاضر کئے گئے اور مولانا شیخ الہند رح کو ان کے تینوں رفقاء کے ساتھ اونٹوں پر سوار کر کے مسلح گارد کی حفاظت میں جدہ روانہ کر دیا گیا۔ حضرت شیخ احباب سے ملاقات فرما رہے تھے اور ارشاد فرماتے تھے۔ الحمد للہ۔ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے۔

## "خدمت کیلئے آیا ہوں۔ خدمت میں رہوں گا"

مولانا حسین احمد صاحب چونکہ جیل خانہ میں تھے۔ آپ کو ان واقعات کا علم صبح کو ہوا جب احباب ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔

مولانا حسین احمد صاحب سے آپ کے احباب نے فرمایا "ہمنے آپ کی رہائی کی بہت کوشش کی مگر
چونکہ شریف بہت خفا ہے اسلئے کم از کم آٹھ دس روز آپکو جیل میں رہنا پڑے گا۔

مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا میں مدینہ طیبہ سے حضرت مولانا کی خدمت کیلئے آیا ہوں
اگر مولانا کو ہندوستان کی بجائے کہیں اور بھیجا گیا تو حضرت مولانا کی خدمت میں میرا رہنا نہایت ضروری
ہے جسطرح ممکن ہو مجھکو مولانا کے پاس بھیجا دیجئے انھوں نے کہا یہ تو بہت آسان ہے ہم ابھی شیخ الاسلام
سے جاکر کہتے ہیں کہ "مادۂ فساد کا باقی رکھنا مناسب نہیں"۔ مولانا حسین احمد صاحب کو بھی مولانا
محمود الحسن صاحب کے پاس ہی پہنچا دینا چاہیئے۔ چنانچہ ظہر کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب
کو جدہ کا حکم ہوا ہے۔ اور پھر اگلے روز خچر پر سوار کر کے جدہ روانہ کر دیا گیا۔

**جدہ سے روانگی** | ان حضرات کو جدہ میں ایک ماہ قیام کرنا پڑا۔ کیونکہ معتمد برطانیہ کرنل
ولسن کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس ہوا تو حکم ہوا کہ ان حضرات کو مصر روانہ کر دیا جائے۔

چنانچہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو خدیوی آگبوٹ پر سوار کرا کر
مصر روانہ کیا گیا۔ ۲۲ ربیع الاول مطابق ۱۶ جنوری کو آگبوٹ سویز پہنچا وہاں تقریباً دیڑھ درجن
گوروں کی مسلح گارد کی حراست میں ان حضرات کو قاہرہ تک پہنچایا گیا۔ اور وہاں جیزہ (جو قاہرہ
کے مقابل دریائے نیل کی دوسری جانب واقع ہے) پہنچا دیا گیا۔ جہاں سیاسی جیل خانہ
بنایا گیا تھا۔ اس جیل خانہ میں اسوقت تقریباً دو سو سیاسی قیدی مختلف ممالک کے
اور بھی تھے۔ جنمیں بیشتر مسلمان تھے۔

اگلے روز صبح کو ان حضرات کو شہر میں لے گئے جہاں جنگی دفتر اور مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہند
کو ایک علیحدہ کمرہ میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ جسمیں تین انگریز موجود تھے۔ جنمیں دو انگریز نہایت
صاف اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

ان کے پاس گورنمنٹ ہند کے بھیجے ہوئے کاغذات کا ایک فائل تھا جس میں سب حضرات کے متعلق رپورٹ تھی۔ حضرت شیخ الہند رح کی ڈائری بہت زیادہ تھی۔ اتفاق سے حضرت شیخ الہند کو اس وقت کچھ پیشاب کا تقاضہ بھی تھا کچھ رفقا کی تنہائی کا خیال اور مزید براں انگریز سے طبعی نفرت ان تمام چیزوں نے حضرت کے لب و لہجہ میں خاص طور پر سختی پیدا کر دی تھی اسوقت بہت سے سوالات کئے گئے۔ جنکے جوابات حضرت شیخ نے اکھڑے طور پر نہایت بے التفاتی کے ساتھ دئے۔ ایک ہندوستانی کی یہ بے پروائی اور یہ طرز خطاب انگریزوں کی نظر میں حیرتناک تھا۔ چنانچہ حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم سے شکایت بھی کی گئی کہ غالباً مولانا کو کبھی حکام سے سابقہ نہیں پڑا۔

ہم ذیل میں سفرنامہ اسیر مالٹا سے ان سوالات اور جوابات کو بجنسہ نقل کرتے ہیں یہ سوالات اور جوابات بذات خود حضرت شیخ کی تاریخ ہیں۔ مزید براں جوابات سے حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز کی ذہانت، ذکاوت، حاضر جوابی کے اندازہ کے ساتھ یہ بھی بخوبی معلوم ہو جائیگا کہ ایک انقلابی عالم کس طرح اپنے دشمن کو احمق بنا سکتا ہے۔

سوال۔ آپکو شریف نے کیوں گرفتار کیا۔ جواب اوس کے محضر پر دستخط نہ کرنیکی بنا پر

سوال۔ آپکے اوپر دستخط کیوں نہ کئے جواب۔ خلاف شریعت تھا۔

سوال۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتوی ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا۔ جواب۔ ہاں۔

سوال۔ پھر آپ نے کیا کیا۔ جواب۔ رد کر دیا۔

لہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں حضرت شیخ الہند کو مذہبی مجنون کہا گیا ہے۔ آپ سوالات اور جوابات کو غور سے مطالعہ فرمایئے اور مجنون کے جنون اور عقلمندوں کی عقل و حماقت کا اندازہ فرمایئے۔

سوال - کیوں جواب - خلاف شرع تھا۔

سوال - آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں جواب - ہاں

سوال - کہاں سے جواب - انھوں نے دیوبند میں مجھسے عرصہ دراز تک پڑھا ہے۔

سوال - وہ اب کہاں ہیں۔

جواب - میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں

سوال - ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے۔ جواب - مجھے کچھ علم نہیں میں نے دیکھا ہے۔

سوال - وہ لکھتا ہے کہ آپ اُسکی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کماندار ہیں۔

مولانا - اگر وہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کماندار میری جیسی حالت ملاحظہ فرمایئے اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے۔ میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گذاری مجھکو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت۔

سوال - مولوی عبیداللہ صاحب نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی۔

جواب - مدرسہ کے مفاد کے لیئے۔

سوال - پھر کیوں علیحدہ کیا گیا۔ جواب - آپس کے اختلاف کیوجہ سے۔

سوال - کیا اوسکا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر نہیں تھا۔ جواب - نہیں۔

سوال - غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے۔ جواب - غالب نامہ کیسا۔

سوال - غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جسکو محمد میاں لیکر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پاشا سے اُسکو حاصل کیا ہے۔

---

لہ کنفدریلیف جواب ہے - ۱۲

جواب - مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں - وہ میرا رفیق سفر تھا - مدینہ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا ہے وہاں سے لوٹنے کے بعد اوسکو جدہ اور مدینہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھیرنا پڑا تھا - غالب پاشا کا خط کہاں ہے جسکو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں -

دسوال کرنیوالا - محمد میاں کے پاس حضرت شیخ - مولوی محمد میاں کہاں ہیں -

سوال کنندہ - وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا -

مولانا - پھر آپ کو خط کا پتہ کیونکر چلا -

سوال کنندہ - لوگوں نے دیکھا - ؎

مولانا - آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز - اور میں ایک معمولی آدمی - میرا وہاں تک کہاں گذر ہو سکتا ہے - پھر میں ناواقف شخص نہ زبان ترکی جانوں نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط - حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہونچا اپنے امور دینیہ میں مشغول ہو گیا - غالب پاشا اگرچہ حجاز کا گورنر تھا مگر طائف میں رہتا تھا میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہو سکتی تھی نہ بعد از حج - یہ بالکل غیر معقول بات ہے کسی نے یوں ہی اڑائی ہے -

سوال - آپ نے انور پاشا اور جمال پاشاہ سے ملاقات کی - جواب - بیشک

سوال - کیونکر -

جواب - وہ مدینہ میں ایک دن کیلئے آئے تھے تو صبح کیوقت انھوں نے مسجد نبوی میں علمار کا مجمعہ کیا - مجھکو بھی مولوی حسین احمد صاحب اور وہاں کے مفتی اُس مجمعہ عام میں لیگئے اور اختتام مجمعہ پر انھوں نے دونوں وزیروں سے مصافحہ کرادیا -

---

؎ ملاحظہ ہو اصل سوال کو کسطرح رلادیا گیا - ۱۲

سوال - آپنے اوس مجمعہ میں کوئی تقریر کی - جواب - نہیں -
سوال - کیوں جواب - مصلحت نہ سمجھی -
سوال - مولانا خلیل احمد صاحب نے تقریر کی - جواب - نہیں -
سوال - مولانا حسین احمد صاحب نے کی - جواب - ہاں
سوال - پھر کچھ انور پاشا نے آپ کو دیا -
جواب - ہاں اتنا معلوم ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لیکر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے -
سوال - پھر آپنے کیا کیا - جواب - مولوی حسین احمد صاحبکو دیدیئے تھے -
سوال - ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی - ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں - اور انگریزونکو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں -
جواب - میں تعجب کرتا ہوں کہ آپکو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گذر چکے ہیں کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہونچ سکتی ہی اور کیا سالہا سال کی اونکی عداوتیں میرے جیسا شخص زائل کر سکتا ہے - اور پھر اگر زائل بھی ہو جائیں - تو کیا اونمیں ایسی طاقت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھکر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہونچا دیں اور اگر پہونچا بھی دیں تو آیا اونمیں آپ سے جنگ کی طاقت ہوگی - لہ
سوال کرنیوالا - فرماتے تو آپ صحیح ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے -

---

لہ جواب خاص توجہ اور پھر تحسین کا خواہاں ہے - ۱۲

سوال۔ شریف کی نسبت آپکا کیا خیال ہے۔ جواب وہ باغی ہے۔
سوال۔ حافظ احمد صاحب کو آپ جانتے ہیں۔
جواب۔ "خوب" وہ میرے استاذ زادے ہیں اور بہت سچے اور مخلص دوست ہیں۔ میری تمام عمر ان کے ساتھ گذری ہے۔

اس قسم کے اور بھی سوالات کئے جنکے جوابات اسی نوعیت کے تھے۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند کو رفقاء سے الگ۔ اندرون جیل خانہ تنگ و تاریک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ جسمیں روشنی کیلئے پشت کی دیوار میں چھت کے قریب ایک روشندان تھا کواڑ لکڑی کے تھے مگر انمیں سوراخ نہیں تھا۔ پاخانہ پیشاب وغیرہ کے لئے ایک بالٹی رکھدی جاتی تھی اور ایک صراحی۔

اگلے روز حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کے اظہار ہوئے اور دو روز تک ہوتے رہے۔ پھر مولانا عزیز گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب۔ مولانا۔۔ وحید احمد صاحب مرحوم کے بیانات لئے گئے۔

بیانات کے بعد ہر ایک کو کال کوٹھری میں بند کیا جاتا۔ ہے ایک گھنٹہ کیلئے ان کوٹھریوں میں سے نکالکر باہر صحن میں ٹہلاتے تھے مگر یکے بعد دیگرے۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک آپسمیں ایک کی دوسرے کو خبر نہیں ہوئی اور سکے بعد ٹہلانے کا وقت ایک ہی کر دیا گیا۔ جسکے باعث آپسمیں ملاقات کر سکتے تھے۔ اس عرصہ میں ہر ایک کو یقین تھا کہ پھانسی کا حکم ہوگا۔

مگر بظاہر ثبوت فراہم نہو سکا لہٰذا پھانسی سے نجات ملی اور مالٹا جانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا روانہ کر دیا گیا جو سیاسی

اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا۔ اور یہ جہاں صرف ایسے فوجی افسروں، یا سیاسی اسیروں کو ہی بھیجا جاتا تھا جو بہت خطرناک اور اپنے خیالات پر نہایت سخت اور پختہ ہوتے تھے اور کسی قسم کی طمع اور ڈر کوئی اثر نہ کر سکتی تھی۔ ۲۹ ربیع الثانی مطابق ۸ فروری کو یہ حضرات مالٹا پہونچے۔ شام کیوقت ان کو اسلئے اتارا گیا۔ تاکہ شہر والے دیکھیں اور خوش ہوں۔ کیونکہ وہ سب عیسائی تھے۔

مالٹا کے متعلق تفصیلی حالات تو سفرنامہ اسیر مالٹا میں ملاحظہ فرمائیں ہم یہاں چند مضامین سفرنامہ سے نقل کرتے ہیں۔ جنکو اس تحریر سے خاص مناسبت ہے۔

**اسیران مالٹا اور اونکی باہم ہمدردی اور مشاغل۔** تمام اسیر تقریباً تین ہزار تھے۔ جنمیں تقریباً نصف جرمنی تھے اور باقی آسٹرین، بلغاری، ترکی، مصری، شامی وغیرہ تھے۔ چونکہ اس مجمعہ میں ہر قسم اور ہر لیاقت اور مختلف زبانوں کے لوگ جمع تھے اور کوئی کام اور خدمت کسی کے ذمہ نہ تھی اس لئے ترقی پسند لوگوں کو اسکی فکر لازم تھی کہ وہ اپنی عمر کا یہ حصہ ضائع نہ کریں اسلئے عموماً لوگوں نے اپنے اوقات کو علوم کی تحصیل اور زبان کے سیکھنے میں صرف کیا۔ اس مجمعہ میں بڑے بڑے پروفیسر مختلف زبانوں اور فنون کے موجود تھے۔ ہر علم اور ہر زبان کی کتابیں یا تو وہیں ملجاتی تھیں۔ ورنہ دیگر ممالک سے منگالی جاتی تھیں۔

اس لئے یہ اسارت گاہ ایک حیثیت سے اچھا خاصہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ خصوصاً سیاسی امور تاریخی حالات اور بالخصوص سیاسیات حاضرہ کیلئے تو گویا یہ جیل خانہ ایک بینظیر کالج تھا۔ جسمیں نہ صرف فکری سیاست کے جاننے والے تھے۔ بلکہ عملی سیاست کے اعلی ماہرین موجود تھے۔

پھر چونکہ یہاں پر سی، آئی۔ ڈی وغیرہ کے خطرات سے کامل اطمینان تھا اس لئے ہر شخص آزادی کے ساتھ تبادلہ خیالات کر سکتا تھا۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ تمام قیدی اتحادی طاقتوں اور بالخصوص انگریزی گورنمنٹ اور انگریز قوم کے دشمن تھے۔ علانیہ انگریزوں کو برا کہتے تھے۔ انگریز یا ان کے کسی حلیف کی شکست کی خبر آتی تو خوشیاں منائی جاتیں۔ جھنڈے اڑائے جاتے۔ اور اگر جرمنی، ترکی وغیرہ میں سے کسی کی شکست کی خبر آتی تو سب کے سب غمگین نظر آتے اگرچہ ان تین ہزار کے مجمعہ میں مسلمان، عیسائی، یہودی، یعنی مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ رنگتیں مختلف، ممالک مختلف مگر ایک دوسرے میں سب شریک تھے اور مصیبت نے سب کو اتحاد کے ایک رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ ہر ایک دوسرے کا فدائی تھا۔ جان نثار اور دل سے ہمدرد۔ وہاں پر ایک عجیب منظر نظر آتا تھا۔ گویا، مذہبی قومی، یا وطنی تفریق عالم انسانیت سے بالکل اٹھ گئی ہے۔ انسانیت کے رشتہ اتحاد نے ایک کو دوسرے سے ایسا جکڑ بند کر دیا تھا کہ گویا ایک دوسرے کا حقیقی بھائی اور رشتہ دار ہے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتا اور جس کو کوئی تکلیف پہونچتی دوسرا اوس کا ہمدرد ہوتا۔ انگریزی افسروں اور فوجیوں کو سب کے سب نہایت غصہ اور رنج کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے عموماً ہر قوم کے ذی علم اور مقتدر حضرات کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اور بہت زیادہ تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے ایام میں مسلمانوں کے علاوہ مقتدر جرمنی اور آسٹرین ملنے اور مبارکبادی کیلئے آتے اور گلدستے وغیرہ پیش کرتے۔ پرنس جرمنی جو قیصر جرمنی کا غالباً بھتیجا تھا۔ اور آمدن۔

جہاز میں بحری کپتان فوج کے عہدہ پر تھا اور تمام قید یونیں شاہی خاندان کا ممبر ہونے کے سبب سے بہت بڑی عظمت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عید کے روز حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ چند منٹ بیٹھتا اور چائے نوش کرتا۔ اوس کے جواب میں حضرت شیخ الہند بھی دو چار مرتبہ اوس کے یہاں تشریف لے گئے۔ اگرچہ ملاقات نہایت مختصر فرمائی۔ جب کبھی راستہ میں مولانا کو دیکھ لیتا ٹوپی اتار کر سر جھکا کر سلام کرتا۔ حضرت شیخ الہند کی صداقت، حقانیت، تقویٰ اور طہارت نے احباب ہی کو مسخر نہیں کر لیا تھا بلکہ دشمنوں کے دلوں پر بھی سکہ جمار کھا تھا۔ بڑے بڑے فوجی افسر۔ جرنیل کرنیل۔ اور میجر باوجود انگریز ہونے کے (اور اس بات کو سمجھنے کے کہ مولانا انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان میں پسند نہیں فرماتے اور آزادی ہند کے خواہاں اور خلافت اسلامیہ کے ہی خواہ ہیں) مولانا کے سامنے نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے۔ ٹوپی اتار لیتے۔ حقیقت یہ ہے مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ۔ (جو خدا کا ہو جاتا ہے خدا اوس کا ہو جاتا ہے۔)

(سفر نامہ اسیر مالٹا صفحہ ۷۶ و صفحہ ۷۹ و صفحہ ۸۰ و صفحہ ۸۱۔)

## مالٹا میں حضرت شیخ کے مشاغل جفاکشی اور استقامت،

عمر میں سب سے بہتر فرصت تھی جو ایک عاشق خدا اور محب رسول کو میسر آئی۔ اوسکا ایک ایک لمحہ غنیمت تھا۔ حضرت مولانا ہر ایک لمحہ کو یاد خدا میں صرف کرتے دن بھر میں اوسطاً دس پارے پڑھ لیتے۔ تین چار ہزار بار اسم ذات کا ورد فرماتے۔ دلائل الخیرات اور دیگر اوراد کا معمول پابندی سے جاری تھا۔ ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف۔ اور جلالین شریف ہمراہ تھی اون کا بھی مولوی وحید احمد صاحب مرحوم کو درس دیتے رہتے تھے۔ ترجمہ قرآن پاک کا مشغلہ بھی نہایت محبوب تھا۔

حضرت شیخ کو ہندوستان کی سردی بھی سخت اذیت دیتی تھی آپ سردی کے
ایام میں ہمیشہ دن کو دھوپ میں سوتے تھے۔ بلکہ معمولی گرمیوں کے زمانہ میں بھی
سردیوں میں آگ اور کوئلہ سے تاپنے کی اکثر عادت تھی۔ روئی کے کپڑے بہت
استعمال فرمایا کرتے تھے۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔ موسم سرما میں اکثر ہاتھوں
اور پیروں پر ورم ہو جاتا تھا۔ جو سینکنے سے دور ہوتا تھا لیکن مالٹا کی شدید سردی میں
شب بیداری کی عادت بدستور تھی۔ جبکہ نوجوانوں کو لحاف سے منہ نکالنا بھی دشوار
معلوم ہوتا تھا یہ شیخ وقت اور قطب عالم ۱/۲ بجے شبکو بیدار ہوتا، استنجا کرتا، وضو کرتا۔
تہجد ادا کرتا۔ اور پھر چونکہ پیشاب کا عارضہ تھا بار بار وضو کرنا پڑتا تھا۔ مگر کیا مجال
کبھی سستی آسکے۔

باوجودیکہ ہر رفیق سفر خدمت کو سعادت سمجھتا تھا مگر تہجد کے وقت اسقدر
آہستہ اٹھتے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ نماز تہجد سے فراغت پاکر ذکر خفی اور مراقبہ میں
مشغول ہوجاتے۔ صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد اشراق کیوقت تک مصلے پر
تشریف رکھتے۔ پھر قرآن شریف وغیرہ سے فراغت پاتے اور رات کے ۱۰ بجے تک
اسی قسم کے مشاغل میں مشغول رہتے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سفرنامہ اسیر مالٹا)

### مراعات کا حکم

غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ایک روز حضرت شیخ کو آفس میں
بلایا گیا۔ کمانڈر نے کہا کہ ہمارے پاس خاص طور سے آپکے متعلق یہ حکم آیا ہے کہ
آپ کی پوری طرح خاطر داری کریں۔ لہذا جو کپتان فوج کے حقوق اور
مراعات ہوتے ہیں وہی آپ کے بھی ہوں گے۔ نیز آپ کو جن چیزوں کی
شکایت ہو اون سے مطلع کریں۔ وغیرہ۔

# چہ می فرمایند جاسوسان فرنگ

وقت ہے کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے متعلق اراکین رولٹ ایکٹ کمیٹی کی تحققات سے بھی ناظرین کو مطلع کر دیا جائے۔

اس رپورٹ میں ایک عنوان قائم کیا گیا ہے " ہندوستانی مذہبی مجنون "[ل]

ان مجنونوں میں سب سے پہلے حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ کا تذکرہ کیا ہے اور وہی افترا اور بہتان دہرایا ہے جس کا تذکرہ پہلے گذرا۔ یعنی یہ کہ۔ یہ عبدالوہاب نجدی کے شاگرد تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سید صاحب کی تحریک کے مسخ شدہ تذکرہ کے بعد سر ولیم۔ ہنٹر آئی۔ سی ایس آنجہانی کا قول۔ ان کی کتاب " ہمارے ہندوستانی مسلمان " سے نقل کیا ہے۔ کہ " اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر یہ ایکٹ (سازشی ایکٹ ۱۸۶۳ء) اس سازش میں استعمال کیا جاتا۔ جس کا نتیجہ ۱۸۶۵ء کی مہم اور اسکی تحقیقاتوں کی شکل میں نکلا۔ تو برطانوی ہند کو ۱۸۶۳ء کی جنگ کی (وہابیوں کی جنگ کی) تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ اگر چند صحیح گرفتاریاں ہو جاتیں تو ہمارے ایک ہزار سپاہی درہ امبیلا

---

ل یہ عجیب فلسفہ ہے کہ بمبئی کے مرہٹے اور بنگال کے انقلابی مذہبی مجنون نہیں تھے۔ جنون کا الزام صرف ان حضرات پر لگایا گیا جن کو مسلمان اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے ہیں، اور جنہوں نے نوع انسان کے نفع کے لئے خود کو قربان کیا؟ یہ ہے اس قوم کا تعصب جو دنیا کو متعصب کہتی ہے اور جس کے تقدس کی کہانیاں۔ سرمایہ داروں کے ایوانوں اور اسٹیجوں پر آئے دن الاپی جاتی ہیں۔ کیا اس عنوان کا مقصود یہ نہیں کہ ایک طرف ہندوؤں کو اور دوسری جانب گر یجویٹ مسلمانوں کو علماء اسلام سے متنفر کیا جائے اور علماء ملت کی بے نظیر جلیل الشان خدمات کی آخری توہین اور تحقیر کی جائے۔

یں قتل ومجروح ہونے سے اور لاکھوں پونڈ کا خرچ بچ جاتا۔

جنگ کے بعد بھی اگر اس سازش میں جو ۱۸۶۴ء کے سیاسی مقدمہ سے منکشف ہوئی۔ حکّامِ انتظامی کے اختیارات کا سخت استعمال ہو جاتا تو غالباً ہم ۱۸۶۹ء کی مہم "کوہ سیاہ" سے محفوظ رہتے "۔

غرض اسی قسم کے دیگر واقعات پر افسوس اور اظہار کرنے کے بعد رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان تحریر فرماتے ہیں :-

ریشمی خطوط والی سازش | اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا۔ جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔

یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان ہی میں تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اُٹھ کھڑے ہوں اور سلطنتِ برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لئے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین رفقا۔ فتح محمد اور محمد علی کو ساتھ لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے۔ اور صوبجات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی۔ وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے بعض لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا۔ اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اثر ڈالا وہ مولانا محمود حسن[1] تھا۔ جو سکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی

---

[1] یہ ہولطیفہ قدرت تحقیق کنندگان کے ذہن میں یہ آیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ اسکے بانی نہیں ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حضرت شیخ الہند عین اس وقت نجات پاکر ہندوستان واپس تشریف لے آئے جب آپکی ہندوستان میں ضرورت تھی اور جمعیۃ علمائے ہند میں روح ڈالکر آپ نے علماء ہند کو سیاست کی اس اونچی سطح پر پہنچا دیا جس پر آج غیر علماء رشک کر رہے ہیں۔ ۱۲۰

رہ چکا ہے ـــــــ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلادے۔ لیکن اسکی تجاویز کے راستہ میں مدرسہ کی مہتمم اور انجمن کے لوگ سدراہ ہوئے۔ انہوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کردیا۔

اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا پھر بھی وہ مولانا محمود حسن کے پاس عام طور پر آتا رہا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے رہے۔ اور اس امر کی اطلاع[1] ملی ہے کہ سرحد سے کچھ آدمی بھی وہاں آتے تھے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دو اور دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کے لئے نہیں بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کے لئے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روانہ ہونے سے پہلے عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی اور ان کو جہاد کے فرض اولی کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود الحسن صاحب بھی شامل ہیں۔ عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اسکو تقویت پہنچے۔ اب ہم ذیل میں ان کوششوں کا

[1] یہ اطلاع دینے والے غالباً دہی انیس احمد صاحب ہیں جو علی گڑھ کالج سے عربی کی تعلیم کیلئے دیوبند گئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کیا۔ مگر اصل راز پر مطلع نہ ہو سکے یہ بھی سنا گیا ہے کہ خفیہ مجالس تہ خانوں میں ہوتی تھیں انیس احمد صاحب ان تک نہ پہنچ سکے تو صرف ایسے حضرات کے فوٹو بھیجنے پر قناعت کی۔

کا ذکر کریں گے جوان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کیلئے کیں۔

عبیداللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونان مذہبی کے پاس گئے۔ اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمنی کے ممبروں سے ملے۔ اور ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا۔ اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لیکر آیا۔ جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم" غالب پاشا" نے مولانا محمود الحسن کو دیا تھا۔ اثناء راہ میں" محمد میاں" اس تحریر (جو غالب نامہ سے مشہور رہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔

عبیداللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت کو مٹا دیا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔

ایک شخص مہیندرا پرتاب اس کا پریزیڈنٹ ہونے والا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خود رائے وہمی سیرت کا آدمی ہے اور ۱۹۱۴ء میں اُسے اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا جینیوا کو گیا۔ وہاں ہردیال سے ملا۔ اور ہردیال نے اس کا جرمن قنصل سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد وہ جرمن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبیداللہ کو اچھی طرح جانتا ہے اسکی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب و غریب اور غیر معمولی آدمی تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی سلطنت کا حکمراں ہے۔ مگر جہاں کام کرنیکا وقت آجائے وہ بہت سست تھا اور کام کرنے سے جی چراتا تھا

وہ وہاں سے کسی خاص مشن کیلئے بھیجدیا گیا۔ کیونکہ اُس نے جرمنوں پر اپنی اہمیت کا اثر مبالغہ آمیز طریق پر ڈالا تھا۔

خود عبیداللہ ہندوستان کا وزیر ہونیوالا تھا۔ اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ، جس نے برلن کے راستہ کابل کا سفر کیا تھا وزیر اعظم ہونیوالا تھا۔ یہ شخص ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا بیٹا تھا۔ اور انگلستان۔ امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا یہ شخص ٹوکیو میں ہندوستانی کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ اور وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار "اسلامک فریٹرنٹی" کے نام سے جاری کر رکھا تھا۔ اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے عہدے سے موقوف کر دیا گیا۔ اور پھر امریکہ جاکر وہ اپنے غدری دوستوں سے مل گیا۔

وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقاصد کے لئے آئے تھے۔ جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے۔ مگر ہندوستانی وہیں رہے۔ اور حکومت عارضی والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زار روس کو اس مضمون کے خطوط لکھے کہ روس کو چاہیئے کہ برٹش کے اتحاد کو خیرباد کہکر ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کے مٹا دینے کی کوشش میں مدد کرے۔ ان خطوط پر مہندر پرتاب کے دستخط تھے۔ آخر وہ خطوط برطانیہ کے ہاتھ آگئے۔ شہنشاہ روس کے نام جو خط تھا وہ سونے کے پترے پر لکھا گیا تھا۔ جسکی عکسی تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے۔

"حکومت عارضی" نے ترکی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز بھی کی۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (صاحب) کو خط لکھا۔ یہ خط اور ایک اور خط مورخہ ۸ رمضان مطابق ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو

محمد میاں انصاری نے لکھا تھا۔ بند کرکے اس نے حیدر آباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے نام ایک نوٹ لکھکر بھیجدیا۔ یہ شخص اس وقت مفقود الخبر ہے۔ شیخ عبدالرحیم سے اس نوٹ میں یہ التجا کی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خطوط مکہ میں مولانا محمود حسن صاحب کو پہنچا دے وہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔

محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں

جرمن اور ترک وفود کا آنا۔ جرمنوں کا واپس جانا۔ ترکوں کا بغیر کسی کام کے رہجانا غالب نامہ کی اشاعت، حکومت کی تجویز۔ خدائی فوج[1] کی مجوزہ ساخت۔

اس فوج کیلئے یہ تجویز تھی کہ اس کے لئے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کئے جائیں۔ اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ محمود حسن ان تمام معاملات کو حکومت عثمانی تک پہنچانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ عبیداللہ کے خط میں خدائی فوج کا ایک نقشہ تھا۔

اس فوج کا ہیڈکوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل انچیف محمود حسن ہونیوالا تھا۔ دوسرے ہیڈکوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ۔ طہران اور کابل میں قائم ہونیوالے تھے۔ کابل میں خود عبیداللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا۔

اس نقشہ میں تین سرپرستوں۔ ۱۲ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اور اعلیٰ فوجی افسروں کے نام تھے۔ لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل ایک کرنل اور چھ لفٹننٹ کرنل ہونے والے تھے۔ جو اشخاص ان اعلیٰ عہدوں کے لئے منتخب کئے گئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے ان کے تقرر کی نسبت مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔

---

[1] کیا خدائی خدمتگار اسی تجویز کا عمل ہے ۱۲ ماسٹر خدا کا شکر ہے کہ مصطفےٰ کمال مرحوم کے ذریعہ سے خدا نے اس نقشہ کو کامیاب فرمایا۔ اب اللہ تعالیٰ اس میں برکت بخشیں۔

لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں۔ ان میں بعض تدارک ضروری تھے اور وہ کئے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار رفقاء برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں۔ اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصہ میں نظر بند ہیں۔

**غالب نامہ کی تشریح** غالب پاشا جس نے غالب نامہ پر دستخط کئے تھے۔ آج کل جنگی قیدی ہے۔ اور وہ اس امر کا اقبال کرتا ہے کہ اس نے اس کاغذ پر دستخط کئے تھے۔ جو محمود حسن پارٹی نے اس کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس کے ضروری حصہ کا ترجمہ یوں ہے۔

ایشیا۔ یورپ۔ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا، قادر و قیوم کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنان اسلام پر غالب آ گئے ہیں ..... اس لئے اے مسلمانوں اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کر دو۔ جس کی قید میں تم پڑے ہو۔

بہت جلد عزم صمیم سے اپنی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لئے وقف کر دو۔ اور ان سے نفرت اور دشمنی ظاہر کرو۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمود حسن آفندی جو پہلے ہندوستان کے مدرسہ دیوبند میں تھے۔ ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے اس خیال میں اُن کی تائید کی۔ اور انہیں ضروری ہدایات دیدی ہیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان پر اعتماد کرو۔ اور آدمیوں۔ روپے اور ہر چیز سے جو وہ طلب کریں ان کی امداد کرو۔

رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ تاہم گذشتہ تحریر سے حضرت شیخ کی جلالت و عظمت اور آپ کی تجویز کا کافی اندازہ ہو گیا۔

نتیجہ | حضرت شیخ کی تجویز بلا شبہ کامیاب تھی۔ مگر افسوس عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی اچانک شکست نے اس کو ناکام کر دیا۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کو عربوں سے سخت کبیدگی اور نفرت ہو گئی تھی۔

جب ہندوستان واپس تشریف لائے تو مراد آباد میں حضرت شیخ کو مدعو کیا گیا استقبال کے لئے اسٹیشن مراد آباد اور اطراف کے والنٹیروں کا بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ ان میں سیوہارہ کے والنٹیر۔ عربی طرز کا عبا پہنے ہوئے اور عقال باندھے ہوئے تھے حضرت شیخ تشریف لائے ان دیسی عربوں کی وردی کو دیکھا تو ارشاد فرمایا۔

یہ غداروں کا لباس ہے۔ اس کو اتار دو۔

آپ نے مذکورہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد یہ بھی اندازہ فرما لیا کہ کس طرح حضرت سید صاحب شہیدؒ کے زمانہ سے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے عہد تک یہ جماعت اپنی ایک اسکیم کے کامیاب کرنے میں ساعی رہی۔

آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ حضرت سید صاحب کے عہد سے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کے عہد تک تقریباً اسی سال میں اسی جماعت نے تین مرتبہ وسیع پیمانہ پر نقشۂ انقلاب تیار کیا۔ اور اس کے لئے ایسی جدوجہد کی کہ اگر تقدیر کا غلبہ تدبیر پر نہ ہوتا تو برطانوی شہنشاہیت کا ہندوستان میں بقا ناممکن تھا۔

آپ ان ناکامیوں سے یقیناً رنجیدہ ہوں گے۔ مگر خداوند عالم مصطفےٰ کمال کو غریق رحمت کرے کہ اُس نے میثاق سعد آباد کے ذریعہ سے دول اسلامیہ کا فیڈریشن قائم کر کے اس اسکیم کے ایک حصہ کو کامیاب کر دیا۔ اب خداوند عالم اس کے خوشگوار نتائج سے مسلمانوں کو بہرہ اندوز کرے۔

# اسارت مالٹا کا زمانہ۔ اور ہندوستان

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے مالٹا سے واپسی پر جو خدمت انجام دی یا تحریک کی بنیاد جس صورت سے رکھی۔ اس کو بیان کرنے سے پیشتر ضرورت ہے کہ ان حالات کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ جو اس عرصہ میں پیش آئے۔ اور جنہوں نے ہندوستان کی سیاست میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔

(۱)

۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ جرمنی کا اعلان ہوا۔ اور نومبر ۱۹۱۸ء کو اس کے التوا کا پہلے گذر چکا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے فروری میں ایک دن مقرر کیا گیا۔ جس میں تمام انگریزوں کو قتل کر ڈالنے کی اسکیم تھی مگر اسلحہ فراہم نہ ہو سکنے کے باعث یہ تجویز فیل ہو گئی۔

بہر حال ۱۹۱۵ء تک انقلابی جدوجہد تشدد اور بیرونی ممالک سے سازش کے اصول پر چلتی رہی۔ مگر ۱۹۱۶ء میں انگریزی حکومت نے اس اسکیم پر بڑی حد تک قابو پالیا۔ ایک قانون نافذ کیا گیا جس کا نام "قانون تحفظ ہند" تھا اور پھر اس جعلی قانون کی آڑ میں ہزاروں نفوس کو جیل خانوں میں بھر دیا گیا۔ اور سیکڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

پھانسیوں پر مرنے والے یا سزایاب ہونیوالے تمام ہندوستان کے جانباز انقلابی مجاہدین کی صحیح تعداد بیان کرنی مشکل ہے۔ صرف صوبہ پنجاب کے متعلق سرکاری رپورٹ ہے کہ ۸۰۔ آدمیوں کے قریب پھانسی دئے گئے۔ ایک سو کالے پانی بھیجے گئے اور چار ہزار کے قریب گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے [1]

---

[1] ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ ص۳۰

(۲) کانگرس اور مسلم لیگ کا اتحاد | مسلم لیگ کے متعلق اگرچہ علامہ شبلی نے فرمایا تھا۔
لیگ کا سنگ بنیاد شملہ ڈیپوٹیشن تھا۔ اور اب آئندہ جو کچھ اس کا نظام بنایا جائے شملہ ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی۔ لیگ کی بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی ہے اس پر جو عمارت بنائی جائیگی ٹیڑھی ہی ہوگی۔ لیگ کی پالیٹکس صرف یہ ہے کہ جو ملکی حقوق اور عہدے ہندوؤں نے حاصل کئے ہیں ان میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔ یہ حقیقی پالیٹکس نہیں ہے حقیقی پالیٹکس گورنمنٹ سے رعایا کے مطالبہ کا نام ہے۔ اور اس جذبہ میں مذہب کی برابر قوت ہے۔ اسی قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ممبر کسی قسم کے نقصان اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اور اپنے میں کوئی عزم اور دلیری نہیں پاتا ؎

لیکن سنہ ۱۹۱۰ء سے کچھ حالات ایسے پیدا ہوتے رہے کہ مسلم لیگ حقیقی سیاست کی طرف قدم بڑھاتی رہی۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں کانگرس کے ساتھ وہ سمجھوتہ ہو گیا جو میثاق لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ء کے نام سے مشہور ہے اور جسکی دفعات حسب ذیل ہیں:۔

میثاق ملی | (۱) مرکزی اسمبلی میں ⅘ منتخب شدہ ممبر ہوں جن میں سے ⅓ مسلمان ہوں۔ (یعنی ۲۷ فیصدی) (۲) صوبجاتی کونسلوں میں ⅘ منتخب شدہ ممبر ہوں اور ⅕ نامزد ممبر ہوں (۳) مسلم اقلیت کے لئے جداگانہ انتخاب باقی رہے۔ اور مسلمانوں کی نیابت مختلف صوبوں میں حسب ذیل ہو ؎

| نام صوبہ | فیصدی آبادی | کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد |
|---|---|---|
| پنجاب | ۵۵ | ۵۰ |
| بنگال | ۵۳ | ۴۰ |

؎ روشن مستقبل ص ۳۹۹ ؎ روشن مستقبل ص ۳۸۴ و ص ۳۸۵

| نام صوبہ | فیصدی آبادی | کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد |
|---|---|---|
| بمبئی | ٢٠ | ٣٣ |
| صوبہ متحدہ | ١٤ | ٣٠ |
| مدراس | ٧ | ١٥ |
| صوبہ متوسط | ٤ | ١٥ |

اسی سال مسز بیسنٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کی جسکی مسلم لیگ نے موافقت کی[1]

(٣) انگریز کی فریب کاری جنگی حالات انگریز کو سراسیمہ کئے ہوئے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق سے اس کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہندو مسلم بلوے اسکے لئے نسخہ شفا ہیں چنانچہ ان کا آغاز ہوا۔ تقریباً ١٩١٣ء کے ختم پر اجودھیا میں قربانی پر جھگڑا ہوا۔ اور حکام نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیکر قربانی بند کر دی ١٩١٣ء میں مظفر نگر میں گاؤکشی پر بلوہ ہوا۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور کہا جانے لگا کہ حکام وقت رعایا میں اختلاف ڈلواتے ہیں۔ اور عام خیال یہ ہو گیا کہ فرقہ دار مصالحت ہو کر جب ہندوستان کا قدم آگے بڑھنے لگتا ہے تو اندرونی طور پر نفاق کی آگ ایسی بھڑکائی جاتی ہے کہ تمام بنے بنائے کاموں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چنانچہ ١٩١٦ء کے مشہور میثاق اور فرقہ دار اتحاد کے ۹ ماہ بعد ٢٢ ستمبر ١٩١٧ء کو اضلاع آرہ شاہ آباد۔ بلیا۔ اعظمگڈھ میں چالیس میل کے رقبہ میں ایسے پیمانہ پر ہندو مسلمانوں کے بلوے ہوئے جن کی نظیر اُس وقت تک ہندوستان کی تاریخ میں نہ تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ ٢٥ ہزار ہندوؤں نے منظم طور پر دیہات کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ مگر غنیمت یہ ہے کہ اُس سال ان فسادات کی آگ ملک میں نہیں پھیلی[2][3]

---

[1] روشن مستقبل ص ٣٦٢ [2] ان اطراف کے رہنے والے مسلمانوں سے جو واقعات زبانی سنے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب نرغہ میں مبتلا ہو کر خدا کی طرف رجوع کریں تو کم من فئۃ (باقی ص ١٥٦ پر)

لیکن دونوں قوموں کے لیڈر اس وقت اعتدال پر تھے۔ ان بلووں سے سمجھوتہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

**شاہی اعلان اور مسٹر مانٹیگو کی آمد**

حتیٰ کہ ۱۸ اگست ۱۹۱۷ء کو کنگ کا مشہور اعلان حکومت خود اختیاری کی بابت شائع ہوا جس میں ہندوستان کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ تھا۔ اس کا سہرا مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کے سر پر تھا۔ جو چند ماہ بعد خود ہندوستان تشریف لائے۔ اور وائسرائے کے ساتھ ملک میں دورہ کر کے پبلک خیالات معلوم کئے

میثاق لکھنؤ کی تکمیل کے باوجود کوشش کی گئی کہ مسلمان اس سے ہٹ جائیں۔ اس کے لئے جماعت تیار کی گئی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور کانگرس اور مسلم لیگ کی متحدہ عرضداشت وزیر ہند کی خدمت میں پیش کی گئی ؎

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۵ گذشتہ) قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (یعنی بسا اوقات تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر خدا کے حکم سے غالب آجاتی ہے) اور خداوند عالم کی غیبی نصرت و امداد کا مظاہرہ اب بھی ہونا ہے ۱۲

؎ روشن مستقبل ص۳۹۶ ؎ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں کہا گیا۔ پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنت برطانیہ کے اہم جزو کے ذمہ دار حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو (روشن مستقبل ص۴۰۲) اس اعلان کی تجدید دوبارہ ۹ فروری ۱۹۲۱ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت بادشاہ کی طرف سے ڈیوک آف کیناٹ نے کی۔ آپ نے فرمایا۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردان ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے اور آپکو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں۔ جن سے میری نو آبادیات کی مانند آزادی حاصل ہو" (روشن مستقبل ص۳۹۵)

اس تقریر کے بعد وائسرائے کی تقریر اور دوبارہ ڈیوک آف کیناٹ (باقی صفحہ آئندہ پر)

(۳)

مسلم لیگ اور کانگریس کا تعلق اس زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقوں تک محدود تھا۔ جو آئینی طور پر متحدہ مطالبات پیش کر رہے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں عام اضطراب اور بےچینی تمام ہندوستانیوں میں محسوس کی جا رہی تھی۔ جس کی وجوہات حسب ذیل بیان کی گئی ہیں[ا]

(۱) چار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک برطانیہ کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان بھی جنگ میں شریک رہا۔ ہندوستان نے بہت بڑی فوج مہیا کی (جسکی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی) پنجاب نے سب سے زیادہ یعنی چار لاکھ آدمی بہم پہنچائے۔ تین قرضہائے جنگ ہندوستان نے ادا کئے اور دس کروڑ پونڈ (تقریباً دو ارب روپیہ) سے سلطنت کی جنگ میں مدد دی۔ اور آدمیوں اور روپیوں سے مدد دینے کے علاوہ مختلف طریقوں سے بالواسطہ طور پر بہت امداد دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی تقریریں ہوئیں۔ جن میں واضح الفاظ میں بیان کیا گیا۔
"اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ پس اس وقت سے ہندوستان معتد بہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائیگا (روشن مستقبل ص۳۹۵)

لیکن انگریزکی یہ دورنگی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس اعلان سے اگلے سال جب کہ واقعات ناسازگار ہوگئے تحریک بند ہوگئی۔ مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے اور (بقول مصنف روشن مستقبل گاندھی جی کا انجن ٹھنڈا ہوکر انجن گھر میں داخل ہوگیا اور عوام الناس کی بھاپ ٹھنڈی ہوگئی اور ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو آدھین مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے جنہوں نے مسٹر مانٹیگو کو مسودہ اصلاحات بنانے کے لئے بڑے شد و مد سے ہندوستان بھیجا تھا۔ ۲ر اگست ۱۹۲۲ء کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں فرمایا "اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں تو اب میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری دست بردار ہو جائیں ــــ جو بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی بحیثیت جماعت مقننہ کے یا بحیثیت مدبران ملک کے خواہ کیسے ہی کامیاب ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہوگا کہ انکا کام انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی مقدار کے بغیر چل سکیگا۔ جو ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں۔ روشن مستقبل ص۴۰۱) آپ نے فرمایا (باقی اگلے صفحہ پر)

[ا] ملاحظہ ہو ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ مترجمہ لاجپت رائے ساہنی باب دوم ۱۲

مگر جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی اور متوسط الحال اور اُن غریب آدمیوں کو بہت بہت تکلیف ہوئی جنکی آمدنی معینہ تھی۔ سفر کرنے کی آسانیوں میں کمی ہو جانے اور مال سوداگری کی درآمد برآمد میں دقتیں پیش آنے سے لوگوں کو بہت پریشانی رہی۔ مزید براں قانون تحفظ ہند اور قانون پریس کے عملدرآمد نے آزادی کے عام معیار پوری یورش کر رکھی تھی۔

(۲) زمانہ جنگ میں تمام تکالیف اور بندشیں اگرچہ سختی سے محسوس کی جاتی تھیں مگر خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے پر یہ تمام تکالیف دور ہو جائیں گی۔ لیکن نومبر ۱۹۱۸ء میں صلح ہنگامی ہو جانے پر غیر معمولی حالتیں اور بھی شدید ہو گئیں۔ معمولی آدمی ہی حالتوں سے بیزار ہو گئے ۱۹۱۸ء میں بارش کی کمی کے باعث قحط نازل[۵] ہوا۔ اور پھر انکم ٹیکس وصول کرنے کے لئے نہایت سخت اور نفرت انگیز قوانین کے ذریعہ سے آمدنیوں کی تحقیق و تفتیش کی گئی۔

پنجاب کے متعدد اضلاع میں انکم ٹیکس ۱۰۰ فیصدی سے ۲۰۰ فیصدی تک بڑھا دیا گیا قانون تحفظ ہند کے ماتحت گیہوں کے ذخیرے ضبط کیے گئے۔ بدنی کی ممانعت کردی گئی۔ غربا کے لئے غلوں کا نرخ کم کیا گیا وغیرہ وغیرہ

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انگریز افسران ملازمت کی تمام عمارت کے لئے بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں۔ اگر اس قالب کو ہٹا لیا جائے تو تمام عمارت منہدم ہو جائیگی صفحہ ۲۰ روشن مستقل صاحب زادہ آفتاب احمد صاحب نے جو اس زمانہ میں لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے بہت واویلا مچایا۔ مگر کون سنتا ہے؟

[۵] اقتصادیات کے ماہر واقف ہیں کہ اب اقتصادی اصول پر بھی قحط پیدا کر دیا جاتا ہے مثال کے طور پر۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ لوگوں کو پریشان کیا جائے تاکہ وہ شورش کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں تو آسان صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ من غلہ کا آرڈر کم نرخ پر دیدیا جائے لامحالہ بازار میں غلہ کا نرخ گھٹ جائیگا۔ پھر اسی طرح دس مرتبہ غلہ کا آرڈر دیا گیا اور ہر مرتبہ آدھ سیر نرخ کم کر دیا تو غلہ بجائے دس سیر کے پانچ سیر کا ہو جائیگا باشندگان ملک پریشان ہو جائینگے

(۴)
منافقت | ایک طرف ۱۸ اگست ۱۹۱۶ء کو شاہی اعلان کے ذریعہ سے حکومت خود اختیاری کی توقعات دلائی گئیں۔ مگر یہی زمانہ وہ تھا جب کہ رولٹ ایکٹ کمیٹی اپنی تحقیقات میں مصروف تھی۔ جس نے ۱۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو وہ مسودے شائع کئے جنکا نام "رولٹ بلز" تھا جن کے ذریعہ سے قانون تحفظ ہند کو گویا دوامی کر دیا تھا۔ اور زمانہ جنگ میں ہندوستانیوں کی وفاداری کا معاوضہ ایسے جابرانہ قانون سے دیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ سے غلامی کی زنجیروں کو بہت زیادہ کس دیا گیا۔ حکام کو مندرجہ ذیل اختیارات دئے گئے۔[۱]

(۱) ضمانتیں مع مچلکہ یا بغیر مچلکہ کے طلب کرنا

(۲) کسی شخص کی بود و باش کو ایک جگہ میں محدود کر دینا یا اسے حکم دینا کہ اپنی نقل و حرکت کی اطلاع دیتا رہے (۳) بعض افعال سے باز رہنے کا حکم دینا مثلاً اخبار نویسی۔ پرچے تقسیم کرنا۔ یا جلوس میں شریک ہونا۔ (۴) اس امر کا حکم دینا کہ کوئی شخص وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس کو دیا کرے۔

(۵) گرفتار کرنا (۶) وارنٹ کے ماتحت تلاشی لینا (۷) بطور تعزیر حراست میں مقید رکھنا (۸) جو ہندوستانی دیگر ممالک میں ہیں اُن کو داخلہ ہند سے روک دینا۔

یہ تھا انعام جو رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں ہندوستانیوں کو دیا گیا جس کی رو سے ہر ایک ہندوستانی کو مشتبہ قرار دیکر ہر قسم کے ظلم روا رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کر دی گئی۔

منافقت کی ایک دوسری مثال یہ تھی کہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو ذیل کا اعلان ہر

[۱] رولٹ کمیٹی کے تحقیقات کی رپورٹ صفحہ ۳۰۴

شہر، قصبہ بلکہ ہر گاؤں میں۔ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ سوڈان اور افریقہ میں بھی تقسیم کیا گیا:۔

"برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ جانیکی وجہ سے جو دولت عثمانیہ نے قصداً بغیر کسی دھمکی دئے جانے کے غلط مشوروں سے شروع کی ہے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ ہزایکسلنسی ویسرائے ہند کو اختیار دیتی ہے کہ وہ عرب کے مقدس مقامات۔ اور عراق کی مقدس زیارتگاہوں اور جدہ کے ساحل کے متعلق ایک عام اعلان کردیں تاکہ ملک معظم کی بہت ہی وفادار ہندوستانی مسلم رعایا کو اس جنگ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہو۔ مذہبی سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدہ برطانیہ کی بحری اور بری فوج کے حملہ اور دست برد سے بالکل محفوظ رہے گا۔ تا وقتیکہ ہندوستانی حاجی اور زوار کی آمد و رفت میں دست اندازی نہ کی گئی۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کے کہنے سے فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اسی قسم کا اطمینان دلایا ہے۔ ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء [1]

اس کے بعد اس اعلان کے کسی حرف کی بھی پابندی کی گئی — ؟

بہر حال ان حالات کے ہوتے ہوئے جن کا تذکرہ گزشتہ نمبروں میں کیا گیا۔ جب ترکی کے حصے بخرے کئے گئے تو ہندوستانی مسلمانوں کے غم و غصہ کی کوئی حد نہ رہی

(۵)

تحریک ستیہ آگرہ | جنگ عمومی ختم ہو جانے پر ہندوستانی غلام جو مرنے سے بچے تھے

---

[1] ترک موالات مصنفہ شیخ الہند مولانا سید حسین احمد صاحب ص ۲۳

ہندوستان واپس کئے گئے۔ ہندوستان پہنچتے ہی ایک طرف رولٹ ایکٹ کا انعام انکو ملا۔ اور دوسری جانب قحط سالی نے (جو خود ہو گئی تھی یا ہندوستانیوں کو پریشانی فاقہ اور بھوک میں مبتلا کرنے کے لئے کرائی گئی تھی) ان کے پیٹ خالی کر دئے۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے بلبلانے کا دلخراش نظارہ دیکھنے لگے۔ جس سے نجات پانے کے لئے فوج میں بھرتی ہو کر موت کے منھ میں گئے تھے۔

اس وقت جنرل اڈوائر اور ان کے ہم مشرب سفید فام درندوں کو افغانستان بھی ہوا بنکر نظر آنے لگا۔ اور بلا شبہہ افغانوں نے جنرل نادر خاں کی قیادت میں گورنمنٹ سے جنگ چھیڑ کر بہت کافی شکست دیدی تھی۔

جنرل اڈوائر۔ وغیرہ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ پنجاب کے کسی ضلع میں کاشتکار لوگ ظلم پر اتر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کہتے تھے۔ کہ برٹش گورنمنٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ نیز معلوم ہوا تھا کہ فوج میں بغاوت پھیلانے کی بھی کوشش جاری ہے۔ ریلوے کے ملازم اسٹرائک پر آمادہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

بہر حال اس میں شک نہیں کہ شہیدان حریت کا خون رنگ لا رہا تھا۔ غم و غصہ کے جذبات کی لہریں تمام ہندوستان بالخصوص دہلی سے کابل تک دوڑ رہی تھیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب جرمنی ختم ہو چکا تھا۔ ترکی سلطنت فنا ہو گئی تھی۔ برطانیہ عظمےٰ کی طاقت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب کے امکانات جو دوران جنگ میں حاصل تھے ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے۔ برطانوی حکام کے تکبر اور غرور کا درجہ بلند ترین سطح پر پہنچا ہوا تھا۔ اُن کو یقین تھا کہ تشدد کے ذریعہ سے رعایا کے سیاسی جذبات کو بجھا کر ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے

اور بلاشبہ ان کے لئے یہ قطعاً ممکن تھا جیسا کہ آئندہ حالات سے معلوم ہوگا۔

اس وقت ایک اہم سوال یہ تھا کہ جذبات حریت کو کس طرح باقی رکھا جائے۔ بلاشبہ اس وقت مسٹر گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن رسا نے نہتی رعایا کے لئے ستیہ آگرہ کا ایک عجیب و غریب نسخہ ایجاد کیا۔ چنانچہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں ستیہ آگرہ سبھا قائم ہوئی۔ اور اعلان کیا گیا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھائیں وہ سول طور پر رولٹ ایکٹ کی مخالفت کریں گے۔ نیز ان قوانین کا جن کا سبھا کمیٹی وقتاً فوقتاً نام بتلائے [1]

اس عجیب و غریب نسخہ نے رعایا کو خفیہ سوسائٹیاں قائم کرنے سے بے نیاز کر دیا۔ جو باتیں پہلے خفیہ کی جاتی تھیں اب علانیہ کی جانے لگیں۔ جیلوں کی کوٹھریاں تفریح گاہ ہوگئیں۔ جن میں لوگ جوق جوق جانے لگے۔

حکام کو کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ تشدد کے ذریعہ سے حد درجہ بزدلی پیدا کرنے کے بعد رعایا میں اس قدر جرأت پیدا ہو جائے گی۔ کہ وہ فوج کی بندوقوں اور پولیس کی لاٹھیوں کی ضربوں کو شاداں و فرحاں برداشت کریںگے۔ ان جدید حالات نے حکام کو بدحواس کر دیا [2]

جلیانوالہ باغ اور مارشل لاء ان بے چینیوں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جو تمام ہندوستان میں عام تھیں اور بالخصوص پنجاب کو ایک بغاوت پر آمادہ کر چکی تھیں۔ یہ بھی گذر چکا کہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو ستیہ آگرہ کی تجویز مقابلہ کیلئے پاس ہوگئی۔ چنانچہ اس پر عمل درآمد شروع ہوا۔ امرتسر اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں ۳۰ مارچ اور ۶ اپریل کو

[1] روشن مستقبل ص ۳۹۵ رپورٹ ہنٹر کمیٹی لاجپت رائے اسامپنی [2] روشن مستقبل ص ۳۹۴

ہڑتالیں ہوئیں اور گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ۹۔ یا ۱۰۔ اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کر کے جلاوطن کئے گئے۔ نیز یہ شہرت ہوگئی کہ مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس سے پنجاب میں عام ہیجان پیدا ہوگیا۔ ۱۲راپریل کو حکومت پنجاب نے حکومت ہند سے مارشل لا کے نفاذ کی اجازت چاہی۔ اور ۱۵راپریل کو لاہور اور امرتسر میں مارشل لا نافذ کردیا گیا

**جلیانوالہ باغ** امرتسر میں ۱۰راپریل کو گرفتاریوں کی خبر سے ایک ہیجان پیدا ہوا ایک عام انبوہ نے بینک پر حملہ کردیا۔ افسروں کو قتل کر ڈالا اور عمارتوں کو آگ لگادی یہ شورش تھوڑی دیر میں ختم ہوگئی۔ پولیس اور فوج کا کافی انتظام امن بحال کرنے کے لئے کردیا گیا۔ جنرل اڈوائر ایک فوج کا کمانڈر ہونے کی حیثیت سے ۱۱رکو فوج لیکر امرتسر پہنچا۔ ۱۳رکی صبح کو جنرل اڈوائر نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا۔

شہر کے بازاروں میں یا شہر کے کسی حصہ میں یا اس کے باہر کسی وقت بھی کسی قسم کا جلوس نکال لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا جلوس یا چار آدمیوں کے اجتماعات کو مجمع خلاف قانون سمجھا جائیگا۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو ہتھیاروں کے ذریعہ سے ان کو منتشر کیا جائے گا [۱]

جنرل ڈائر نے اپنی فوج لیکر شہر کے کچھ حصہ کا گشت کیا اور اس حکم کو خود مشتہر کیا۔ لیکن جب وہ ۱۲ بجکر ۴۰ منٹ پر اپنے کیمپ واقع رام باغ میں واپس آیا تو اسکو خبر پہنچائی گئی کہ شام کو ۴½ بجے جلیانوالہ باغ میں عام جلسہ ہوگا۔ وہ جلسہ کے وقت مشین گنیں اور فوج لیکر جلیانوالہ باغ پہنچا۔ راستہ کی تنگی کے باعث مشین گنیں

(۱) رپورٹ ہنٹر کمیٹی صفحہ ۱۰۶

باغ تک نہیں پہنچ سکیں۔ وہ فوج کے ایک دستہ کو اندر لے گیا اور تمام راستہ گھیر کر فوج کو کھڑا کر دیا ـــــ مجمع کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار تھی۔ ایک شخص اسٹیج پر تقریر کر رہا تھا جنرل اڈوائر نے بلا کسی تنبیہہ اور اطلاع کے فائر کا حکم دیا۔

سرکاری بیان کے بموجب یہ فائر اس وقت تک ہوتے رہے جب تک فوج کے پاس کے کارتوس ختم نہ ہو گئے ـــ پہلی گولیاں چلتے ہی لوگ سب طرف سے بھاگنے لگے۔ لیکن آج معافی کا سلسلہ بند تھا۔ فائر برابر جاری رکھے گئے۔ حتی کہ ۳۷۹ آدمی ہلاک اور بارہ سو زخمی ہو کر میدان میں ڈھیر ہو گئے۔[1]

بہت سے لوگوں نے لیٹ کر جان بچانی چاہی۔ مگر اُن پر اسیطرح فائر کئے گئے۔

تعداد مقتولین | مسٹر ایڈورڈ ٹامسن تحریر فرماتے ہیں: "ہمارے دشمنوں نے جلیانوالہ باغ کے مقتولین کی تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ اصرار کے ساتھ کئی ہزار کی تعداد بتلاتے تھے۔ اگرچہ مجھے ان کی صحیح تعداد یاد نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ چند منٹوں میں پندرہ سو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[2]

اس خونی ہنگامہ کی پوری تفصیل کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے" مسٹر موصوف کے حوالہ سے صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:۔

سوال۔ تمہیں کس وقت علم ہوا کہ تمہارا خاوند باغ میں قتل کر دیا گیا۔؟

جواب۔ گولی چلنے کے کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے بازار میں سنا کہ ہزاروں آدمی قتل کئے گئے ہیں۔ یہ سنکر میں پریشان ہو گئی۔ اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ فی الفور باغ میں پہنچنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ہمسایہ عورتوں کو ساتھ لیکر وہاں پہنچی جہاں پر تمام جگہ کو

---

[1] رپورٹ ہنٹر کمیٹی صـ۸۳ـ [2] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ صـ۱۲

مردہ لاشوں سے بھرا ہوا پایا ــــ میں نے اپنے مقتول خاوند کی لاش کو ان میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ چنانچہ لاشوں کے انبار کے نیچے سے میں نے اپنے خاوند کی لاش کو کھینچکر باہر نکالا وہ تمام جگہ خون کا تالاب نظر آتی تھی۔ میں نے اس لاش کو گھر پہنچانے کے لیے امداد کی تلاش کی۔ مگر ناکام رہی ۔ آخر کار مایوں ہو کر واپس آگئی اور اپنے خاوند کی لاش کے پاس بیٹھکر اسی طرح تمام رات گذار دی۔ جہاں پر کتوں کی کثرت کی وجہ سے مجھے اکثر چھڑی استعمال کرنی پڑتی تھی۔ رات کے دو بجے ایک سکھ زخمی کے کراہنے کی آواز سنکر اس کے پاس گئی۔ اور اسکی ٹانگ کو ٹھیک کر کے رکھ دیا جس سے اس غریب کو کسی قدر افاقہ ہوا۔ وہاں پر ایک بارہ سال کا زخمی بچہ بھی تھا۔ جو تمام شب روتا رہا۔ اور بار بار مجھ سے یہی التجا کرتا رہا کہ میں اس کے پاس بیٹھی رہوں۔ کیونکہ اس حالت تاریکی میں وہ ڈر محسوس کرتا تھا۔ پاس ہی ایک اور زخمی تھا جو نہایت دردناک طریقہ سے تمام رات پانی کے لئے التجائیں کرتا رہا۔ میں نے ہر چند پانی مہیا کرنیکی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ ناکام رہی۔ تمام رات زخمیوں کی دردناک چیخیں سنتی رہی۔ یا کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے ہنہنانے کی مکروہ اور بھیانک آوازیں آتی رہیں[ا]

خدا جانے کتنی غریب عورتیں ہونگیں جو اپنے نوجوان جگر پاروں یا سرتاج شوہروں کی لاش بھی نہ دیکھ سکیں ــــ

غرور اور دور زندگی کا آخری نمونہ یہ ہے کہ اڈوائر سے اتنا بھی نہ ہوا کہ شفاخانوں میں پہنچوانے کی اجازت دیدیتا۔ یا اولیا اور وارثوں کو اجازت بھی مل جاتی کہ وہ اپنے عزیزوں کی لاشیں اٹھا لائیں۔

لطف یہ ہے کہ۔ جنرل اڈوائر اس تمام وحشت اور بربریت کو اخلاق کی

[ا] انقلاب ۱۸۵۷ کی تصویر کا دوسرا رخ۔

تعلیم فرما رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے تحریری بیان میں فرمایا تھا:۔

" میں خیال کرتا ہوں کہ یہ فائروں کی قلیل ترین مقدار تھی۔ جس سے وہ دور رس "اخلاقی اثر" پیدا ہوتا جس کا مہیا کرنا میرا فرض تھا۔ اگر زیادہ فوج اس وقت مہیا ہوتی تو نسبتاً نقصان جان بھی زیادہ ہوتا۔

مارشل لاء۔ مغرور حکومت کے جبر و قہر کا دوسرا مظاہرہ "مارشل لاء" تھا جو تقریباً ڈیڑھ ماہ تک پنجاب کے بیشتر اضلاع میں جاری رہا۔ ان تمام مظالم کا بیان کرنا طوالت طلب ہے جو اس سلسلہ میں عمل میں لائے گئے۔ ہم صرف اُن درندگیوں کی فہرست[1] بیان کرتے ہیں جن کا مظاہرہ کیا گیا۔

(۱) لاہور میں لفٹنٹ گورنر۔ چیف سکرٹری اور فوجی حکام کے روزانہ مشورے ہوا کرتے تھے۔ اور ہر وقت نئے نئے احکام جاری ہوتے۔ جن کی نوعیت آئندہ تحریر سے واضح ہوگی:۔

شہر کے معززین کو حکم تھا کہ صبح ۸ بجے سے ۵ بجے شام تک وہ احکامات سننے کے لئے "واٹر ورکس اسٹیشن" پر حاضر رہیں اور جو حکم دیا جائے اسکو عام باشندگان شہر تک اپنی ذمہ داری سے پہنچاتے رہیں۔

(۲) شام کے ۸ بجے سے صبح کے ۵ بجے تک باہر نکلنے کی ممانعت تھی۔ خلاف ورزی کی سزا گولی تھی۔ دو شخصوں کا ساتھ ساتھ چلنا ممنوع تھا۔ دس آدمیوں سے زیادہ کا اجتماع خلاف قانون قرار دیا گیا۔

(۳) موٹر کار۔ اور تمام سواریاں فوجیوں کے لئے بیگار میں لے لی گئیں۔ برقی

---

[1] یہ تمام مضمون ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ مترجمہ لاجپت رائے ساہنی سے ماخوذ ہے ۱۲

روشنی اور پنکھے چھین لیے گئے۔ یورپین کو لائسنس دیگر اس قسم کی بیگار سے مستثنے کردیا گیا۔

لفٹننٹ کرنل فرینک جانسن نے اپنے تحریری بیان میں لکھا تھا۔

" نمبر ۳ کے مطابق تمام موٹر کاریں فوجی کام کے لیے حوالہ کردینے کا حکم تھا لیکن جہاں سے مجھے تسلی ہوگئی تھی کہ یورپینوں کے کاروبار کے لیے موٹر کی ضرورت ہے میں نے ان کو مستثنے کردیا تھا۔ میں نے کسی ہندوستانی کو مستثنے نہیں کیا۔ کیونکہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ وفاداروں اور غیر وفاداروں سب کو مارشل لاکی تکالیف کا کچھ مزہ چکھانا چاہیے۔ تاکہ آئندہ اُن کے رسوخ کا وزن نہ دل سے باغیانہ تحریکات کی تائید میں نہ ہو۔

(۴) لفٹننٹ موصوف نے حکم کیا کہ مارشل لا کے تحت میں جو احکام جاری ہوں گے وہ ان تمام مالکان مکانات کے حوالے کئے جائیں گے۔ جنکو میں تجویز کروں۔ اور مالکان مکانات کا فرض ہے کہ اس قسم کے تمام احکام کی نمائش کریں۔ اور اس نمائش کو جاری رکھیں خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ اگر چسپاں شدہ اعلان خراب ہوگیا تو سخت سزا دی جائیگی۔ چنانچہ سناتن دھرم کالج کے احاطہ کی دیوار پر ایک نوٹس چسپاں کیا گیا تھا۔ جسکو کسی نے پھاڑ ڈالا۔ لفٹننٹ موصوف کا حکم ہوا کہ احاطہ میں جس قدر مرد ہوں سب گرفتار کرلیے جائیں۔ چنانچہ تمام پروفیسر اور طلبہ گرفتار کیے گئے۔ اور تین میل ان کو پیدل لیجایا گیا۔ ۳۰ گھنٹہ کی حراست کے بعد پرنسپل کی ضمانت پران کو رہا کیا گیا۔

(۵) اسی قسم کے معمولی شبہہ کی بنا پر متعدد کالجوں کے ایک ہزار سے زیادہ طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ تین ہفتہ تک حاضری دیا کریں جس کے لیے ان کو روزانہ مئی کی دھوپ میں ۱۶ میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد فیصدی کے حساب سے کچھ تعداد مقرر کرکے

حکم ہوا کہ ان کو کالجوں سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔
اسی قسم کے احکام دوسرے اضلاع میں جاری کئے گئے جن کی وجہ سے ۶ سالہ چھوٹے بچے بھی حاضری دینے پر مجبور تھے۔ جن میں سے کچھ لو لگ کر مر بھی گئے۔

(۶) حکم ہوا کہ اگر کسی جگہ کوئی بم گرا تو اس کے آس پاس کے مکانات منہدم کر دیئے جائیں گے۔

(۷) امرتسر میں ایک گلی تھی۔ جہاں ۱۰ راپریل کو مس شیروڈ پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس گلی کے بیچ میں ایک ٹکٹکی کھڑی کر دی گئی۔ بلا ثبوت صرف شبہہ کی بناپر چھ آدمیوں کو پکڑ کر اس ٹکٹکی سے باندھ کر تازیانے لگوائے گئے۔
تمام آدمی جو اس گلی سے گزریں۔ خواہ وہ اس گلی کے رہنے والے ہوں یا کسی اور محلہ کے وہ اس گلی سے صرف رینگتے ہوئے گذر سکتے تھے۔ یعنی ہاتھ زمین پر ٹیک کر بندر کی طرح چلیں۔ اتفاق سے یہ گلی بہت لانبی تھی، اور اس کے گذرنے والوں کو اسی طرح سے گذرنا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ گرفتار کر لئے جاتے۔ اور تازیانہ وغیرہ کی سزا دی جاتی۔

(۸) لائلپور میں حکم کیا گیا کہ جب کوئی انگریز سامنے سے گذرے تو اگر کوئی ہندستانی گاڑی۔ تانگہ وغیرہ میں سوار ہو تو گاڑی سے اتر کر اور اگر چھتری لگائے ہوئے ہو تو چھتری بند کر کے مودب کھڑے ہو کر سلام کریں۔
کسی ایک اسکول کے دو طالب علموں نے سلام نہیں کیا تو تمام اسکول کے طلبہ کو حکم ہوا کہ وہ دفتر کے سامنے حاضر ہو کر یونین جیک کی سلامی دیں۔ اُن کے ماسٹر رجسٹر لیکر ساتھ آئیں۔ غیر حاضروں کو سخت سزا دی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۹) "قصور" میں ایک اسکول ماسٹر نے رپورٹ کی کہ اُس کے لڑکے اُس کے قابو

میں نہیں رہے۔ مارشل لا کے افسروں نے طے کیا کہ تمام لڑکوں کو سزا دینے کے بجائے چند لڑکے چھانٹ لئے جائیں۔ چنانچہ اسکول ماسٹر نے چھ لڑکوں کو سزا کے لئے منتخب کیا۔ افسران مارشل لا نے جب اُن کو دیکھا تو اس وجہ سے کہ وہ دُبلے پتلے تھے۔ اُن کو چھوڑ کر ۶ موٹے تازے لڑکوں کو منتخب کر کے ۱۵-۱۵ تازیانے لگوا دئے۔ کچھ لڑکے گرفتاری سے بچنے کے لئے فرار ہو گئے۔ تو اُن کے والد اور قریبی رشتہ داروں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔

سرکاری رپورٹ کے بموجب اس قسم کے احکام کی خلاف ورزی میں متعدد اضلاع میں (۲۵۸) آدمیوں کو ۵ سے لیکر ۳۰ تک تازیانہ کی سزا دی گئی۔

(۱۱) فوجوں کے دستے دیہات میں بھیجے گئے۔ جہاں اُنہوں نے اندھا دھند جسکو چاہا پکڑ کر کوڑے لگائے اور سزائیں دیں۔ مقصود یہ تھا کہ آئندہ بغاوت میں شریک نہ ہوں۔

(۱۲) متفرق دیہات پر محض مرعوب کرنیکی خاطر ہوائی جہازوں سے بم پھینکے گئے۔ اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی گئی۔ جن سے نقصان مال بھی ہوا اور نقصان جان بھی۔ قصور کچھہ نہ تھا۔ البتہ وحشت اور بربریت کا یہی تقاضا تھا۔

(۱۳) اس جرم میں کہ کچھہ لائنیں اکھاڑ دی گئی تھیں ٹرینوں میں مسلح سپاہی سوار کر کے روانہ کی گئیں۔ اور حکم ہوا کہ جو دیہاتی لائن کے آس پاس ملیں انکو گولی ماردو۔

ایک گاؤں ریلوے لائن کے قریب تھا۔ وہاں کچھہ آدمی نظر آئے لالہ سریرام سود" جو اس ٹرین کا افسر تھا۔ اور فوجی سولجر ٹرین سے نیچے اترے ور اُن پر فائر کرنے شروع کر دئے۔

(۱۴) دیہات کے باشندوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نمبر دار۔ لائنوں کے پاس پہنچیں اور ان کی حفاظت کریں۔ خلاف ورزی پر ان کا گاؤں تباہ کر دیا جائیگا۔

غریب دیہاتیوں کو ایسا کرنا پڑا۔

(۱۵) شہری علاقوں کے لئے یہ بھی دھمکی دی جاتی تھی کہ اگر مارشل لا کی خلاف ورزی ہوئی تو اسی روز پانی اور روشنی بند کردی جائے گی۔

مارشل لا کا مقصد | یہ تھی ان وحشیانہ مظالم کی مختصر فہرست جو مارشل لا کے سلسلہ میں روا رکھے گئے۔ جن کا مقصود انگریزی افسران کے بیانات کے بموجب جو انہوں نے تحقیقات کے وقت ٹریبونل کے سامنے دیئے۔ یہ تھا کہ

ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کئے جائیں۔

# "حصول آزادی کے لئے پروگرام"

گذشتہ تحریر کسی قدر طویل ہوگئی۔ اور ممکن ہے ناظرین کرام بے جوڑ بھی تصور کریں مگر ہمارا منشا یہ تھا کہ آئندہ جو پروگرام اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے تجویز کیا گیا۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقعہ مل سکے۔

آج کل شد و مد سے کہا جاتا ہے کہ علماء ملت دوسری قوموں سے ملکر ستیہ اگرہ۔ یا سول نافرمانی کی تحریک میں کیوں شریک ہوگئے۔ آج مسلمانوں کے رجعت پسند لیڈر۔ ستیہ آگرہ یا سول نافرمانی کو خودکشی قرار دے رہے ہیں۔ ایک عام پروپاگنڈا ہے کہ علماء آیات جہاد کو بھول گئے۔ وغیرہ وغیرہ ــــ لیکن ۱۹۱۵ء تک علماء ملت کی خدمات جو نہایت دیانتداری اور موثق حوالجات سے پیش کی گئیں۔ اُن کے مطالعہ کے بعد ہر انصاف پسند کے لئے یہ فیصلہ آسان ہوگیا کہ علماء ملت نے اس راستہ کو نادانی یا غفلت سے اختیار نہیں کیا۔

کیا اعتراض کرنے والے اپنی جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی پیش کرسکتے ہیں جس نے توس مکھن اور آرام کرسی کے سوا شاہرہ انقلاب کی گرد چھانی ہو۔ احمق پھپھوندوی کا ایک شعر ان راحت طلب مصلحین قوم کی حالت کا مرقع ہے ؎

سوچا تھا قوم کے متعلق بہت سا کام ــ لیکن خیال ہنگہ و موٹر میں رہ گیا

علماء ملت صحیح طور پر اور بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بارہا حریت اور انقلاب کی قربانگاہ پر خود کو پیش کیا۔ انگریزی اقتدار کے ابتداء سے آج تک اُن کے خیالات۔ انقلاب کا نقشہ قائم کرتے ہیں اور ان کی عملی طاقتیں انقلاب کو بروئے کار لانے میں مصروف رہی ہیں۔ حضرت سید صاحب شہیدؒ کی تحریک کے آغاز سے ۱۹۱۵ء تک

یعنی صرف ۸۵ سال کے عرصہ میں ہندوستان کی صرف یہی ایک جماعت ہے جس نے چار مرتبہ انقلاب کی جدوجہد کی ـــ بے عمل اعتراض کرنے والوں کے پاس اب بھی پر تشدد انقلاب کے لیے کوئی پروگرام نہیں۔ مگر آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان بزرگان ملت نے واقعی طور پر ہر مرتبہ نہایت عظیم الشان نقشہ مرتب کیا۔ اور پھر اس کے لیے ہر ایک قسم کی قربانی پیش کی۔ یہ دوسری بات تھی کہ تدبیر پر ہمیشہ تقدیر غالب آتی رہی۔ اور کارپردازان قضا، و قدر کا فیصلہ یہی رہا کہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کا دردناک عذاب چکھتا رہے۔

بہر حال اب نقشہ دگرگوں تھا۔ جسکی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(۱) جنگ عمومی نے جرمنی اور ترکی کو شکست دیکر ان تمام توقعات کو ختم کردیا جن کی بنا پر ۱۹۱۵ء تک انقلابی سازشیں ہوتی رہیں۔ اور اب انگریز کی طاقت پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی۔ اور حدود سلطنت اتنے وسیع ہوگئے کہ اُن میں آفتاب نہیں چھپتا۔

(۲) جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مارشل لانے ہندوستانیوں کو کافی سبق دیدیا کہ شورش بغاوت یا حریت طلبی کو ایک جابر اور قاہر حکومت کس طرح کچل سکتی ہے۔

(۳) افغانستان اور ایران کی تو کیا مجال کہ وہ برطانیہ کے مقابلہ پر ہندوستان کی تحریک انقلاب کا ساتھ دیں۔ ہاں زار روس کی حکومت ختم ہونے کے بعد سوویٹ روس کی حکومت برطانیہ کے مخالف تھی اور ہندوستانیوں کا ساتھ دے سکتی تھی۔ لیکن اولاً تو لینن اور اسٹالن کے خیالات سے آجتک ہندوستانی متفق نہیں۔ علاوہ ازیں سوویٹ رُوس کی طاقت اس وقت تک اس قابل نہیں تھی۔ اس سے زیادہ اہم اور قابل غور سوال یہ ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کو حریت نصیب ہوگی۔ یا محض آقاؤں کی تبدیلی ہوگی اور بس۔

(۴) جبکہ کوئی بیرونی طاقت پشت پر نہ ہو تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلحہ اور قوت کے ساتھ انقلابی جدوجہد کے لئے خرچ کا کیا انتظام ہو۔

جدید اسلحہ حرب کے ایجاد نے خرچہ جنگ اس قدر بڑھا دیا ہے جو ہمارے حد وحساب سے بھی بالا ہے۔ ۱۸۵۷ء تک سامان جنگ بندوق یا معمولی درجہ کی توپوں کا نام تھا لیکن اب ہوائی جہاز، مشین گن۔ بم کے گولے۔ ٹینک وغیرہ وغیرہ کی ایجاد کے باعث خرچہ جنگ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بقول علامہ شکیب ارسلان جنگ عمومی میں تمام حکومتوں کے تقریباً "۱۲ ارب" پونڈ خرچ ہوئے۔ یعنی تقریباً دو سو ارب روپیہ۔ یعنی سالانہ پچاس ارب روپیہ یومیہ تقریباً ۱۵ کروڑ روپیہ۔

آپ تمام حکومتوں کے مصارف جنگ کو چھوڑئیے۔ صرف اپنے ہندوستان کو لیجئے، جس نے قرضہ جنگ کے سوا دس کروڑ پونڈ یعنی تقریباً دو ارب روپیہ سے جنگ عمومی میں برطانیہ کی امداد کی اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کیا۔

بالفاظ دیگر تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ انگریز کو روزانہ دیتا رہا

(۵) اس سے بھی زیادہ اہم سوال ایک اور ہے۔ جو علماء سے زیادہ اعتراض کرنے والے حضرات کے لئے قابل غور ہے۔ جس کا نظریہ یہ ہے کہ ہمیں دنیائے اسلام کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف اپنا انتظام کرنا ہے [۱]

سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کسی کے طفیل میں کچھ آزادی حاصل کر بھی لے تو آیا اسکو باقی بھی رکھ سکیگا یا نہیں۔ — دنیا نے ہمیشہ ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھا۔ اور آج بھی وہ اپنی زرخیزی کے لحاظ سے سونے کی چڑیا ہے اور

---

[۱] مسٹر محمد علی جناح ۱۲

دنیا کی حکومتیں اس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ فاتحین کا قبلہ گاہ رہا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ ہر آنے والے کے سامنے گردن جھکاتا رہا۔ سبب کیا ہے؟

وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانی کو اپنے ہندوستانی ہونے کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ اور اس ملکی اور وطنی جذبہ کے فقدان سے وہ دوسروں کا غلام اور اپنی قوم کا غدار بنتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ استقلال کا حاصل کرنا اور اسکو باقی رکھنا صرف اس پر موقوف ہے کہ اہل وطن کے دل جذبات وطنیت سے اتنے پُر ہوں کہ اُن کو قربانیوں پر آمادہ کر سکیں۔ افغانستان کبھی کسی کا غلام نہیں بنا۔ انگریزوں نے بار بار حملہ کیا۔ دو مرتبہ فتح بھی کر لیا۔ مگر ہر مرتبہ تھوڑے دنوں بعد نکلنا پڑا۔ کیونکہ پٹھان کی غیرت نے اپنے اوپر غیر قوم کی حکومت گوارا نہیں کی۔

اب جبکہ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے تو اسکی حریت کا حصول اور پھر بقا صرف اسپر موقوف ہے کہ ہندوستانیوں کے دل جذبات وطنیت سے لبریز ہوں اور مذہبی اختلافات کو اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے وطن کے معاملہ میں ایک قوم کی حیثیت سے تمام دنیا کے مقابلہ پر آئیں۔

یہی وہ "متحدہ قومیت" ہے جسکو کفر و شرک کے مرادف بتایا جا رہا ہے۔ کیونکہ انگریز کے لئے پیغام فنا یہی قومیت ہے

علمار ملت اور پُر امن جد و جہد (۲) سیدنا حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت جب کہ انقلاب کے بعد جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتی تھی جسکی صدارت کے لئے "راجہ مہندر پرتاپ" اور بقول ارکان رولٹ کمیٹی وزارت کے لئے ہر دیال۔

اجیت سنگھ۔ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی وغیرہ وغیرہ کو منتخب کر لیا گیا تھا۔ تو یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ شیخ الہند دنیا کی سیاست سے قطعاً علیحدہ کوئی ایسی حکومت ہندوستان میں قائم کر رہے تھے۔ جس میں ہندو کی حیثیت صرف ذمی کی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کا نصب العین مکمل آزادی۔ اور پروگرام انقلابی اور پُر تشدد تھا اور اسی وجہ سے ان حضرات نے کانگرس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ لیکن اب جبکہ جرمنی کی شکست نے سیاست کا نقشہ بالکل ہی پلٹ دیا۔ تو علماء ملت نے دوسرے راستہ کی تلاش شروع کی۔ چنانچہ مسلم لیگ اور کانگرس کے اتحاد کے دور میں جب دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا گیارھواں اجلاس انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس کیساتھ دہلی میں ہو رہا تھا۔ تو مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب مولانا عبداللطیف صاحب دہلوی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی وغیرہ وغیرہ نے مسلم لیگ کے اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اس اجلاس میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری صدر استقبالیہ تھے۔ جنکا خطبہ گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا۔

بہرحال پر امن اور آئینی سیاست کے پلیٹ فارم پر علماء ملت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے کوئی مؤثر پروگرام اُس وقت تک نہ کانگرس کے پاس تھا نہ مسلم لیگ کے پاس۔ صرف عرضداشتیں تھیں یا احتجاجات۔ اور یہی سبب بھی تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کا اجتماع ہو رہا تھا

سنہ ۱۹۱۹ء کے ابتدائی مہینے وہ ہیں جن میں ستیہ گرہ کا پروگرام دریافت کیا گیا اور ملک کو اسپر چلنے کی دعوت دی گئی۔

لیکن اس وقت ستیہ گرہ کا منشا محض رولٹ ایکٹ کا مقابلہ تھا۔ لیکن اس کے بعد مفکرین ہند نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ آزادی ہند کو ایک اقتصادی تقاضا قرار دیکر ہندوستان کی سیاست کو تمام دنیا کی سیاست کے ساتھ وابستہ کردیا۔ اور ایک بعید منزل تک کے لئے ترک موالات اور ستیہ آگرہ کو حصول مطالبات کا پروگرام مقرر کیا۔

# جمعیۃ علماء ہند کا قیام

۱۹۱۹ء پہلا سال ہے۔ جس میں پرامن جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ انقلاب اور حریت کے متعلق جو مشورے خفیہ ہوا کرتے تھے اب اس کے لئے اجلاس منعقد کیے جانے لگے۔ تو علماء ملت جو ہمیشہ انقلاب کی راہ میں پیش پیش اور اس کے نصب العین میں انتہا پسند رہے۔ اس موقعہ پر بھی وہ پیش پیش تھے۔

وطنی مطالبات کے لئے انڈین نیشنل کانگرس تھی۔ جس میں جملہ زعماء ہند نے شرکت کی۔

خلافت اسلامیہ سے متعلق مطالبات منوانے کے لئے اسی سال خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ تحفظ ملت اور سیاسیات میں مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی گئی۔ جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی۔ امرتسر میں ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی۔ خلافت کمیٹی کا اجلاس زیر صدارت مولانا شوکت علی مرحوم اور مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم امرتسر میں ہوا ——— قیام جمعیۃ کے وجوہ اور حالات حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوں گے جو جمعیۃ کی روئیداد سے لیا گیا ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو جب دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ اتحادیوں سے عموماً اور حکومت برطانیہ سے خصوصاً ان وعدوں

کے ایفا کا مطالبہ کیا جائے جو مسلمانوں سے جنگ عمومی کے وقت کئے گئے تھے۔ تو خلافت کے اس جلسہ میں علمار نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انہیں ایک رابطہ میں منسلک کیا جائے۔ جن کی اجتماعی قوت کو ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بالکل منتشر کر دیا تھا ہندوستان کی سیاست محض چاپلوسی۔ خوشامد اور اظہار وفاداری پر محدود ہو چکی تھی۔ گویا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاستدان وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو حکومت مسلطہ کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علمار مذہب جو طبعاً خوشامد اور چاپلوسی سے متنفر ہیں اور جو بڑے بڑے بادشاہوں کے مقابلہ میں ان کا ...الحق کے عادی رہے ہیں اس سیاست سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔

نیز ۱۸۵۷ء میں علمار حق کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا۔ اور جس بیدردی کے ساتھ علمار ہند کو پھانسی اور جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اس کا مقتضا قدرتاً یہ ہوتا تھا کہ علمار کو مجبوراً گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنی پڑی۔

چونکہ مسلمانوں کی سیاست نے ۱۹۱۹ء میں پھر پلٹا کھایا۔ اور خوشامد اور تملق کی پالیسی تبدیل ہوئی۔ تو علمار ملت نے دوبارہ سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اور جمعیۃ علمأ ہند کا قیام کیا گیا ع۵

---

ع۵ بحوالہ روشن مستقبل ص۴۸۵۔

# سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی

## مالٹا سے رہائی اور ہندوستان میں تشریف آوری

ایک طویل تحریر کے بعد پھر موقعہ آیا ہے کہ سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حالات بیان کئے جائیں۔ گذشتہ تحریر کا منشا یہ تھا کہ حضرت شیخ کی اسارت کے چار سال میں ہندوستان کن حالات سے گذرا۔ تاکہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے اُس مسلک کے دلائل بھی سامنے آجائیں جسکو حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مالٹا سے واپسی پر اپنے لئے منتخب فرمایا۔ اور پھر اسی پر کاربند ہونے کی عام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی۔

**رہائی** ۲۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ اپنے رفقا کے ساتھ مالٹا سے سرکاری حفاظت میں روانہ کئے گئے۔ سرکاری نگرانی اور حفاظت ہی میں "سیدی بشر" میں اٹھارہ ۱۸ روز اور سویس میں پونے دو ماہ قیام کرتے ہوئے۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو یہ حضرات بمبئی میں ورود فرما ہوئے اور اس وقت معلوم ہوا کہ وہ آزاد ہیں۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ ابھی جہاز ہی میں تھے کہ سرکاری مولوی "مولوی رحیم بخش" انگریزی ایجنٹ کی حیثیت سے حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دلائل اور براہین کے ساتھ خیر خواہانہ انداز میں درخواست کی کہ حضرت شیخ ہندوستان کے سیاسی جھگڑوں میں شرکت نہ فرمائیں۔ کمزوری کا آخری زمانہ عافیت کے ساتھ یاد خدا میں

بسر فرما دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ نیز یہ کہ بمبئی اترتے ہی مولانا دیوبند کو روانہ ہو جائیں۔ خلافت والوں کے ہاتھ نہ پڑیں۔ مگر وہاں تو قبول شنیے۔

ع یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

آپ کا قلبی مذاق یہی سیاست تھا۔ مرض وفات کے زمانہ میں کئی مرتبہ فرمایا کہ اگر اس مرض سے اچھا ہو گیا۔ تو اس تحریک کی اشاعت میں سارے ہندوستان کا دورہ کروں گا۔[1]

بہر حال خلافت کمیٹی بمبئی نے نہایت عظیم الشان استقبال کیا۔ ایڈریس پیش کئے ۲۲-۲۳-رمضان ۱۳۳۸ھ کو بمبئی میں قیام رہا۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر ۲۵ ر رمضان کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ پھر اتوار کی صبح کو روانہ ہو کر ۲۶ ر رمضان المبارک، بوقت ۹ بجے صبح اسٹیشن دیوبند پر ورود فرمایا۔

راستہ میں اہل میرٹھ نے ایڈریس پیش کیا۔

راستہ کے اسٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا۔ دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہجوم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شہر اور دیہات کے لوگ زیارت کے لئے حاضر تھے۔

**شیخ الہند کا خطاب** | معلوم ہوا ہے کہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے یہ خطاب انتخاب کیا تھا۔ جو اسم گرامی کا مقبول اور مشہور جز بن گیا۔

**قدوم مبارک کی برکت** | حضرت شیخ وعظ اور تقریر کے عادی نہیں تھے۔ لیکن انفاس قدسیہ اور خلوص نیت کی برکت تھی کہ برقی سرعت کے ساتھ تمام مسلمانوں کے دل و دماغ پر تحریک کا تسلط ہو گیا۔ اب تک علماء کرام اور زعماء ملت کی تقریریں بھی ہو رہی تھیں۔ وعظ۔ لیکچر، پروپاگنڈے۔ تقسیم سلطنت عثمانیہ پر نوحہ۔ یکا۔ اجلاس اور جلوس سب کچھ تھے۔ جلیانوالہ باغ کا اشتعال انگیز حادثہ بھی پیش آ چکا تھا۔ لیکن مسلمانوں

[1] سفر نامہ اسیر مالٹا صفحہ ۱۲۸

کے قلوب گویا کسی اطمینان کے طالب تھے۔ حضرت شیخ کی تشریف آوری نے اس طلب کو پورا کر دیا۔ اور اب مسلمان کا قدم سب سے تیز تھا۔ ہر ایک شخص تحریک کا متوالا۔ جان اور مال کو قربان کرنے کے لئے آمادہ۔

ایک تھوڑی مقدار جو مخالف تھی اُسکی حالت یہ تھی کہ جب دہلی میں اس گروہ کے ایک بہت بڑے شخص کا انتقال ہوا۔ تو باوجودیکہ وہ پہلے علما نیز عام مسلمانوں میں بہت زیادہ رسوخ اور مقبولیت رکھتا تھا لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے لئے مسلمان تیار نہیں تھے۔ گھر کے مخصوص آدمیوں کے سوا کوئی شخص شریک جنازہ نہیں ہوا۔ مجبوراً جنازہ کو موٹر میں قبرستان پہنچایا گیا۔ (معاذ اللہ)

شیخ الہند۔ اس وقت درحقیقت شیخ الہند تھے۔ پورے ہندوستان کے مسلمہ قائد آپ ہی تھے۔ حضرت شیخ الہند ہی کی برکت تھی کہ آپ کی پارٹی کے افراد ہندوستان کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے گئے۔ اور اسی کا اثر تھا۔ کہ گاندھی جی بھی اعتراف کیا کرتے تھے کہ میں مولانا محمد علی کی جھولی کا ایک مہرہ ہوں۔

ایک خاص برکت۔ جس کے دوبارہ مشاہدہ کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ اور بظاہر ترستی رہیں گی، یہ تھی کہ شہر اور دیہات کے تقریباً تمام ہی مسلمان نمازی بن گئے ضلع سہارنپور کے دیہات کی یہ حالت تھی کہ پنج وقتہ نمازیوں کی کثرت سے مسجدوں میں جگہ ملنی مشکل ہوتی تھی۔

**سیہ بختیٔ مسلم** | بلاشبہہ حضرت شیخ الہند کی تشریف آوری پر مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح فراہم ہوا تھا کہ توقع ہوتی تھی کہ اب اُن کے اقبال کا تارہ گردش سے نکل چکا۔ لیکن افسوس ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے     کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مرض الوفات کا آغاز تھا۔ آپ کو وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرت بول کا عارضہ بھی قدیمی تھا۔ اسپر مالٹا کی سرد موسم۔ اور مزید براں حضرت والا کی شب بیداری ریاضت اور قلت غذا۔ با ایں ہمہ پیرانہ سالی۔ اور پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جدو جہد کی ناکامی کا صدمہ۔

ان تمام اسباب کی بنا پر گویا مرض کا سلسلہ مالٹا ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ تک راستہ کی مشقت اور ہندوستان پہنچنے کے بعد مخلوقات کا ہجوم۔ تحریک کی ترقی مشاغل کی کثرت۔ یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں۔ انتہا یہ کہ آپکو دق ہو گئی۔ مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی ہمت و استقلال۔ ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لئے سبق آموز ہے کہ تپ دق کا آخری اسٹیج ہے۔ چلنا۔ پھرنا تو درکنار، بیٹھنا بھی ممکن نہیں۔ مگر اسی حالت میں تحریک کی قیادت جاری ہے۔ اجلاسوں کی شرکت کے لئے سفر ہو رہا ہے۔ صدارت فرمائی جا رہی ہے

العظمۃ للہ۔ عقل دنگ رہجاتی ہے کہ بستر مرگ پر ایک شیخ فانی کا یہ بے پناہ جذبہ عمل۔

**مسلم نیشنل یونیورسٹی کا قیام اور حضرت شیخ الہند کی صدارت**

اسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ نے یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا۔ اور ایک دوسری یونیورسٹی بنام مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنی چاہی۔ حضرت شیخ الہند کو صدارت کیلئے منتخب کیا۔ حضرت شیخ الہند کی بیماری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ کروٹ بدلنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ خدام نے اس حالت میں سفر اور پھر صدارت کو بہت زیادہ خطرناک

تصور کیا۔ اور اصرار کے ساتھ حضرت شیخ کو منظوری صدارت سے منع کرنا چاہا۔
لیکن حضرت شیخ کا جواب یہ تھا ”اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہو گی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا“

چنانچہ پالکی میں لٹا کر حضرت شیخ کو دیوبند کے اسٹیشن پر لے گئے۔ دار العلوم دیوبند کے طلبا نے پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

یہ اجلاس ۱۶۔ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں ہوا حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ خطبۂ صدارت کے مندرجہ ذیل فقرے خاص طور پر یادگار ہیں۔

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اُٹھو۔ اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا۔ اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

(۲) اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں گھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم ”علیگڈھ“ کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں ”دیوبند اور علیگڈھ“

کارشتہ جوڑا۔

(۳) آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بلاشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں۔ تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

(۴) ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور اُن میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانیکا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا۔ جو گورنمنٹ کی اعانت اور اُس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جسکا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

مسٹر گاندھی کی قیادت | حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی (رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند) اس بیان کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی تصدیق حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد نے بھی فرمائی کہ اس زمانہ

میں ایک اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ تحریک سول نافرمانی میں ہندوستان کا قائد۔ ہندو بنایا جائے یا مسلمان۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قیام فرما تھے۔ آپ نے اپنی پارٹی "مولانا محمد علی مرحوم۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم وغیرہ وغیرہ سے اس سلسلہ میں گفتگو فرمائی۔ اوران حضرات کو ہدایت فرمائی کہ آئینی اور پُرامن تحریک میں ہندوستان کا واحد لیڈر کسی ہندو کو ہونا چاہیے۔ تاکہ تحریک کا بار بقدر حصہ اکثریت پر رہ سکے۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ لیڈر کس کو بنایا جائے۔ ہندوستان کے حلقہ میں لوکمان تلک۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ لالہ لاجپت رائے۔ مسٹر گاندھی وغیرہ جیسے لیڈر موجود تھے۔

حضرت شیخ نے۔ ان سب میں مسٹر گاندھی کو قیادت عامہ کیلئے منتخب فرمایا۔ مسٹر گاندھی کو اشکال تھا کہ وہ پُرامن جنگ میں عام مسلمانوں کی حمایت اور امداد کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی فطرت میں شوق جہاد رچا ہوا ہے۔ تو حضرت شیخ نے تقریبا ایک گھنٹہ کے تخلیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا فلسفہ بیان فرماتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال عدم تشدد کی جنگ پر عامل رہے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

**اجلاس دوم جمعیۃ علماء ہند کی صدارت** ۷-۸-۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹، ۲۰، ۲۱- نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا۔ جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے نہایت اہم تھا۔

حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور

میں تھے۔ مگر علمار ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ العلما حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے۔ اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرے جن پر کاربند ہوکر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا۔ مگر علمار ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا

حضرت شیخ کے اس خطبہ نے علمار ملت کو مندرجہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی (۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہی (۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہے۔

(۳) استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے۔ مگر اس طرح کہ مذہبی حدود میں رخنہ نہ واقع ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ۔ بندوق۔ ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدار کے لئے جائز ہوسکتا ہے۔ (باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہرے اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ۔ بندوق۔ ہوائی جہاز نہیں۔ یہی چیزیں ہتیار ہیں (صہ۱۶ خطبۂ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

"کچھ شبہہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے

زیادہ کثیرالتعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول
میں مؤید بنا دیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا
ہوں۔ اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدین کی ہر
اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت
حالات اگر اس کے مخالف ہو گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے
گی۔ اُدھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور
اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بد اعمالیوں سے
حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہیگا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں
بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا
کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو۔ ان اقوام کے اجتماعی نصب العین
کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں ہم میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج
پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار
دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی
ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز
اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ
امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا
جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ
کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات
میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں۔ لیکن

محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری یہ گذارش دونوں قوموں کے زعما (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔ کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اگر فرض کرو۔ ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے۔ یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیئے مہلک نہیں۔ البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسری کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں۔ اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں ـــ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔ (ص۲۱ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

آپ نے مسلمانانِ ہند۔ اور علماءِ ملت کو وصیت فرمائی۔

جو صراط مستقیم آپنے معلوم کر لیا ہے قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیے۔ اور یمین و شمال کی طرف مطلق التفات نہ کیجیئے۔

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ۔ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ[1]۔ جو لوگ آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور موعظہ حسنہ سے اپنی جماعت

---

[1] (ترجمہ) بیشک یہ ہے میرا سیدھا راستہ تم اسپر چلتے رہو۔ اور کسی دوسرے راستہ پر مت چلو کہ یہ دوسرا راستہ تم کو سیدھے راستہ سے جدا کر دے گا۔ ۱۲

کے اندر جذب کیجئے۔ اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو "بالتی ھی احسن" ہونی چاہئے۔
(ص ۱۷ خطبہ صدارت)

اراکین جمعیۃ علماء ہند کو معاذ اللہ ہندو پرست کہنے والے حضرت غور فرمائیں کہ
شیخ الہند قدس سرہٗ کے متعلق ان کا کیا فیصلہ ہوگا۔

اور اگر آج موجودہ علماء سے کسی پر تشدد جدوجہد کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ تو کیا
حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی مبارک عمر کے پچاس سال۔ انقلابی جدوجہد پر صرف نہیں کئے تھے۔

میرے دوستو۔ انصاف کرو۔ یہ وہی مولانا محمود الحسن ہیں جنہوں نے ۱۲۹۶ھ
میں دارالعلوم دیوبند میں ثمرۃ الترتیب قائم فرماکر نصف صدی انقلابی جدوجہد
میں صرف کی اور آج ۴۲ سال بعد مسلمانوں کو ایک مشترکہ اور آئینی جدوجہد کی ہدایت
فرما رہے ہیں۔ کیوں ؟ جوابات پہلے گزر چکے۔

جامعہ ملیہ۔ دہلی۔ کی بنیاد | اسی دوران میں۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے
جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو اس نظریہ کے بموجب قائم کیا گیا تھا "کہ علوم عصریہ کی
اعلیٰ تعلیم کے لئے ایسی آزاد درسگاہ ہو جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثرات سے
بالکل آزاد ہو۔ اور جس کا تمامتر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"

رحلت | جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سے صرف ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ
مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء بروز منگل۔ اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

---

۱؎ (ترجمہ) ایسی طرح سے جو بہت ہی بہتر ہو۔ یہ بات خیال رکھنے کی ہے کہ علماء تفسیر کی تحقیق کے بموجب یہ حکم اس وقت ہے جب اسلحہ کے ذریعہ سے جہاد ممکن نہ ہو یا مصلحت کے خلاف ہو۔ ان کی تعلیمات کے بموجب عدم تشدد کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہو۔ ۱۲ ۲؎ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند۔

اعزا واقارب کے اصرار پر جنازہ دیو بند لایا گیا۔ خلقت کا بے انتہا ہجوم تھا۔ دو جگہ دہلی میں پھر میرٹھ اور مظفر نگر کے اسٹیشن پر اور آخر میں دیو بند میں جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔

مولانا محمد علی صاحب مرحوم نے روتے ہوئے فرمایا: "آپکی وفات نے کمر توڑ دی"

هٰذا ما تيسّر لي من سير تهٖ - واٰخر دعوانا
ان الحمد لله رب العالمين - والصلوٰة والسلام
علىٰ جميع الانبياء والمرسلين وعباده الصالحين
المقربين
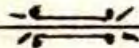
خاکپائے علماء
محمد میاں عفی عنہٗ

# حضرت علامہ غازی مولانا عبیداللہ صاحب سندھی
# حضرت علامہ غازی مولانا محمد میاں صاحب انصاری

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کے ساتھ ان دونوں انقلابی بزرگوں کے مختصر حالات بھی درج کر دیے جائیں۔ جس سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے متعلق ہم اس وقت اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے جس قدر اخبارات میں شائع ہو چکا ہے

**حضرت علامہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی خود نوشت**

۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو حضرت سندھی جلاوطنی سے نجات پاکر کراچی تشریف لائے۔ وزارت سندھ جس نے آپ کی رہائی کے لئے جدوجہد کی تھی۔ تشریف آوری کے وقت استقبال کا اہتمام کر رہی تھی خود اللہ بخش صاحب وزیر اعظم صوبہ سندھ مجمعہ کے آگے آگے جہاز کی گودی پر موجود تھے۔ اخبارات نے آپ کے متعلق مختلف بیانات شائع کرنے شروع کر دئے۔ تو حضرت موصوف نے اپنی سرگذشت خود مرتب فرما کر اخبارات کو بھیجی تھی۔ جسکو رسالہ قائد بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ نے بھی شائع کیا تھا۔ یہاں بجنسہ درج کی جاتی ہے۔

**میرا خاندان اور مولد** میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری ہے۔ لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا۔ اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً حضرت سلمان فارسی کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں

مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لئے کہا تو عبید اللہ بن راماین رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کا کاردار تھا۔

پیدائش اور یتیمی | میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا۔ تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔

جیونی کی عربی عائشہ

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا۔

اس دوران میں دو سال کے لئے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اس لئے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اسکول میں شروع میں ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام | ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اسکے مطالعہ میں مصروف رہا۔ اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلان) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انہیں کے توسط سے مجھے مولانا محمد اسمٰعیل شہید

کی "تقویۃ الایمان" ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پرانگ شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھنوی کی کتاب احوال الآخرت پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی۔ اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز کیا۔

احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں، ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

**اظہار اسلام** | ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو کوٹلہ علیٰ سے میں نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبد القادر تھا۔ عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ، ضلع مظفرشاہ میں پہنچے۔ ۹ ذوالحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اس طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

**سید العارفین کی صحبت** | اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والی) کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اسی طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابو الحسن امروٹی)

جن کا ذکر آگے آئیگا اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبید اللہ نے اللہ کے لئے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا۔ اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میر نہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں۔ اور اسی لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بنگیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لئے خاص دعا فرمائی" خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے"

میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

**سید العارفین کے خلیفہ** پھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بھاولپور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں "دین پور" پہنچا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولانا عبد القادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آ گئی۔ اور واپس لیجانے کے لئے بہت زور لگایا۔ مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خانپور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڈھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

**دار العلوم دیوبند** صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب

سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا، حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اسی طرح صفر ۱۳۰۵ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ دیوبند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے دروس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۶ھ کو ہدایہ تلویح مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا۔ اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبد العزیز ثانی ہوگا۔

چند دوستوں نے مبشر خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے حضرت شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جہاں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی مثلاً تاویل المتشابہات، ناممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم وہی علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۶ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا جامع ترمذی حضرت مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

شاہجہان آباد دہلی بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی آیا۔ حکیم محمود خان کے علاج سے افاقہ ہوا۔ حدیث

کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کرلیں مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی ہیں۔ اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی زیارت کے لئے گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں درس بھی سنے

**معاودت سندھ** ۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۳۰۳ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا۔

میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۳ھ میں حضرت شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

**سید العارفین کے دوسرے خلیفہ** شوال ۱۳۰۸ھ سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن صاحب تاج محمود کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میرے لئے بمنزلہ باپ تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زی کی لڑکی سے کرایا۔

میری والدہ کو بلایا وہ میرے پاس آخر وقت تک اپنی طرز پر رہی۔ میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک باطمینان مطالعہ کرتا رہا۔

**کتب خانہ پیر صاحب العلم** گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے

پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ میں دوران مطالعہ میں وہاں جاتا رہا۔ اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میری تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انہیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔

حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق سے تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کرکے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلہ علماء میرا رہبر بنا۔ اور میں نے انکو اپنا امام بنا لیا۔

مجھے اپنی علمی اور سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہو گئیں۔ اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوستہ ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اسی کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علماء کی ایک جماعت کو حجۃ اللہ البالغۃ

پڑھائی۔ اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہند سے پڑھی۔

طریقہ قادریہ | اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال واذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابوالسراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانیکی ضرورت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان | دوران مطالعہ میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی سوانحعمری دیکھی اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات          اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لیکر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یعنی حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنے خیالات کے موافق آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند | میں ۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر

دوبارہ شفہیا اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا ذکر آگیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دیکر اسکو اتحاد اسلام کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ رہے۔

**دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا** امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا۔ دو دو سال تک چلایا۔ بعض عربی اور سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک ماہنامہ رسالہ "ہدایت الاخوان" چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لئے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے سنہ ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی امتحان کے لئے تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ علیہ اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی۔ اور امام مالک کو بھی خواب میں دیکھا

**جمعیۃ الانصار دیوبند** ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصل حالات سنکر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قایم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیۃ کی تحریک و تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی

احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

**نظارۃ المعارف دہلی** حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قایم ہوئی۔ اسکی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھکر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیجکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابو الکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

**ہجرت کابل** ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لئے میری طبعیت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے بھی اپنا نمایندہ بنا دیا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتلا سکے۔

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ جس جماعت کے نمایندے تھے اسکی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

ہیں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے ملکر کام کرنے کا حکم دیا۔ اسکی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بنگیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگرس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔

حیات روس ۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینے ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لئے سویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ اس زمانہ کی لادینی کے حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ سوسلسٹ بھی ہیں اور نیشنلسٹ بھی

سُتوم سویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون رہا اور شکر گزار رہوں گا۔ اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا فللہ الحمد وحدہٗ

**نئی ترکیا** سنہ ۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لئے سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے ملکر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہیں لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تقریباً تین سال میں ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا ہے مجھے مستقبل قریب میں اس کے لئے کوئی مرکز نظر نہ آیا۔ اس لئے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگرس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

**ہمارا پروگرام** یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنا تا رہا ہوں —— اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جبتک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ انکی سہولت کے لئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلۂ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار سال پہلے زمانہ میں

بیجا کر کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اسکی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لئے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اسکی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے[1] دور میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدہا فہو احق بہا۔

مکہ معظمہ پہنچا | ۱۳۴۴ھ میں موسم حج پر مکہ معظمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی میرے تمام دوست اس میں آرہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستہ سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے ایک طرح میں محفوظ ہو گیا۔

اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیا امور حاسح نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاہم اللہ خیراً۔

علماء مکہ سے استفادہ | مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی۔ و

[1] یعنی ہجرت سے پیشتر مکہ معظمہ میں اور ایک سال تک مدینہ طیبہ میں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حاجی علی جان ہلی والے - دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی مرحوم - تیسرے ابوالشرف مجددی - ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا - عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے -

**میرا علمی مشغلہ** میں یقیناً ۱۳-۱۴ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا - تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لئے مشکل تھے اس زمانہ میں انہیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حاصل کر سکا جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا -

لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک اعلیٰ نصاب نظر آیا - اس میں اس تجلی ربِ مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے -

میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا - مثلاً بدور بازغہ - خیر کثیر - تفہیمات الہیہ - سطعات - الطاف القدس - لمعات وغیرہ

ان کی کتابوں کے لئے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذغان اور مولانا اسمٰعیل شہید کی طبقات اور مولانا محمد قاسم کی قبلہ نما تقریر دلپذیر اور آب حیات کا استعمال کیا -

**مراجعت وطن** ۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی - اور میرے تمام دوست اسکی تائید میں کام کرتے رہے - اس میں

سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی۔ اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔

جبال الصولتیہ۔ بلد الحرام۔ عبید اللہ

**حضرت علامہ مولانا محمد میاں صاحب عرف مولینا منصور انصاری** آپ کا دولت خانہ قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارنپور ہے۔ آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم کے حقیقی نواسہ ہیں۔ آپکے والد ماجد مولانا عبد اللہ صاحب انصاری تھے۔ جو علی گڈھ کالج میں شعبہ تعلیمات کے ناظم رہے۔

آپ نے دیوبند میں تعلیم پائی۔ اور پھر حضرت شیخ الہند کے فیض صحبت نے آپکو اسلام کا جانباز مجاہد بنا دیا۔

**آپ کی جلیل القدر خدمات کی فہرست** (۱) جمعیۃ الانصار دیوبند کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے ــــ اس کے ناظم حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تھے اور نائب ناظم آپ تھے

(۲) مدرسہ عالیہ دیوبند کو "دار العلوم" بنانے میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) دار العلوم معینیہ اجمیر شریف میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔

(۴) حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی رفاقت میں حجاز کا سفر کیا۔

(۵) ۱۹۲۰ء میں افغانستان کی طرف ہجرت کی۔ اور آزاد قبائل کو ایک تعلیمی اسکیم کے ذریعہ سے بیدار کرنے اور ایک وفاق پر جمع کرنے کی کوشش کی۔

(۶) بخارا کے انقلاب میں اسلامی رجحانات کے مطابق حصہ لیا۔ اور انوریا شا کی تحریک کو قوت پہنچائی۔

(۷) افغانستان کی پہلی خفیہ سفارت فوق العادت متعینہ ترکیہ میں "وزیر مختار" مقرر کیے گئے۔ اور اپنے رفیق سفارت سردار محمد گل موجودہ وزیر داخلہ افغانستان کے ہمراہ روسی حدود میں گرفتار ہوئے۔ تین ماہ سوویٹ روس کی قید میں رہے۔ اور بمشکل جان بچا سکے۔ جیل سے رہا ہو کر ماسکو گئے۔ جہاں پُر زور استقبال ہوا۔ اور افغانی سفارت فوق العادت متعینہ ماسکو میں سفیر کی حیثیت سے شریک رہے اس سفارت کے کے سکریٹری افغانستان کے مشہور وزیر خارجہ علامہ سردار "فیض محمد خان" تھے۔

(۹) جنگ عظیمہ کے بعد نوجوان ترکوں کی حکومت کے صدر مقام انگورہ بھیجے گئے اور افغانستان کی سفارت میں رکن اعلیٰ مقرر کیے گئے۔

(۱۰) سمرنا کی فتح کے وقت افغانستان کے وزیر مختار کی حیثیت سے جشن فتح منعقدہ انگورہ میں سرکاری طور پر تقریر کی۔

(۱۱) انگورہ سے واپس ہو کر افغانستان اور ترکی کے درمیان کُریر (شاہی قاصد) کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ اور وزارت خارجہ کے شعبہ مشرقی کے ماتحت سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ (۱۲) آجکل گوشہ نشیں ہیں۔ اور علمی اسلوب پر اسلامی اجتماعیات کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ اکثر اوقات قرآن حکیم کے درس اور طلبہ کی اجتماعی تربیت پر صرف ہوتے ہیں۔ آپ کی گراں قدر تصانیف جو شائع ہو چکی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حکومت الٰہی (۲) اساس انقلاب یا مراقبۂ نماز (۳) مجمل بعیت تا بعیت یعنی سورہ فاتحہ کی مجمل سیاسی تفسیر (۴) دستور امامت امت (۵) انواع الدول[۵]

---

[۵] یہ تمام کتابیں کتب خانہ فخریہ امروہیہ گیٹ مراد آباد سے مل سکتی ہیں۔ انواع الدول کا اردو ترجمہ رسالہ قائد "مراد آباد میں شائع ہو رہا ہے۔ بہترین تصنیف ہے

# اکابر دارالعلوم دیوبند کا چوتھا طبقہ

## از ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء تا ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء

**اکابر۔** حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب
امام العصر سیدنا حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب۔ سیدی حضرت مولانا
حافظ عزیز الرحمن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند

اس طبقہ کا آغاز ۱۳۳۹ھ سے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی سنہ میں طبقہ سوم کا اختتام قرار دیا تھا۔ اگرچہ اس طبقہ کے اکابر کی خدمات بہت پہلے سے شروع ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

## حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

آپ حجۃ الاسلام سیدنا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے خلف رشید تھے۔ ۱۳۱۲ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قرار دئے گئے۔

آپ ستودہ صفات۔ پاکباز عالم تھے۔ آپ کو خداوند عالم نے ایک دولت عظمٰی عنایت فرمائی تھی۔ جس کے اعتبار سے آپ کو اپنے وقت کا سب سے زیادہ خوش نصیب کہا جا سکتا ہے۔

خداوند عالم نے آپ کو فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی کی رفاقت اور اس درجہ خُلّت عطا فرمائی تھی۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ بہت کوششیں کی گئیں۔ کہ اس باہمی موانست میں فرق پیدا ہو۔ مگر وہ ایسا مضبوط رابطہ تھا جس میں کسی وقت کوئی فرق نہیں آیا۔ آپکا دور اہتمام دارالعلوم کیلئے مبارک و مسعود تھا

جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۱۲ھ میں مدرسہ کی آمد و صرف کا اوسط سات ہزار تھا۔ اور طلبہ کی کل تعداد ۲۹۳۔ لیکن وفات کے سال یہ اوسط اسی ہزار سے متجاوز ہو چکا تھا۔ اور طلبہ کی کل تعداد چھ سو سے زائد تھی۔

بیشک ہم حضرت موصوف کی کوئی سیاسی خدمت شمار نہیں کرا سکتے۔ لیکن اگر تقسیم کار کا اصول قابل قدر ہے تو اس میں شک نہیں کہ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ العزیز نے اگر درسی اور سیاسی خدمات کے لئے اپنی ذات گرامی کو قربان کر دیا تھا۔ تو آپ نے دار العلوم کی مالی ترقیات کے لئے ہمیشہ اپنی ہستی کو وقف کئے رکھا۔

آپ اہتمام کے ساتھ۔ تدریس اور وعظ کی خدمات بھی دیتے تھے۔

۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۳ھ آپ ریاست حیدر آباد میں عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) کے مفتی اعظم رہے۔

آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں آپنے خطاب واپس کر دیا۔

**فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب** | خلف رشید حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی۔ آپ ایک متبحر عالم اور عربی کے بہترین ادیب تھے۔ آپ کا تدبر، سیاست دانی، حلم، انتظام، دور اندیشی اور دور بینی آج تک ضرب المثل ہے اور تاریخ دیوبند میں ہمیشہ بے نظیر سمجھی جائے گی۔

دار العلوم کی حیرت انگیز ترقی میں جس طرح روحانی امور کو دخل ہے۔ بلاشبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی ان خداداد صفات کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ آپ نحیف الجثہ اور کمزور تھے۔ غذا بہت تھوڑی۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ

اس ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت آپ کو عطا کی گئی تھی۔

امور اہتمام میں شب و روز انہماک کے باوجود کتب بینی کے شوق نے آپ کے مطالعہ کو بے حد وسیع کر دیا تھا۔

آپ کی علمی یادگاریں آپ کے عربی قصائد اور دیگر تصنیفات ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) حاشیہ مقامات حریری۔ جو حل لغات کے ساتھ۔ پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوا

(۲) قصیدہ لامیۃ المعجزات۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے۔ جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سو معجزات نہایت فصیح اور بلیغ انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔

استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ دار العلوم دیوبند نے ان کی اردو میں شرح کی ہے۔

اس کے مطالعہ سے آپ کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ *

(۳) "اشاعت الاسلام" دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" آپ کی تاریخ دانی کی ایک مثال ہے۔ یہ کتاب تقریباً پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ان تاریخی وجوہات کو ذکر کیا گیا ہے۔ جو دنیا میں اشاعت اسلام کا سبب ہوئیں۔

(۴) تعلیمات اسلام۔ اس کتاب میں اسلام کے طرز حکومت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ مشورہ کو خلیفہ اسلام کے لئے کتنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس بارہ میں آپ کا آخری فیصلہ بجنسہ پہلے گذر چکا۔ مختصر یہ کہ اگر خلیفہ کی ذات پر کلی اعتماد ہو تو اکثریت اور اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اگر امیر کو اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا

چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سیاست میں بھی آپ کو اتنا ہی شغف ہوتا جتنا دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ تو آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا۔ سیاسی لیڈر مانا جاتا۔

لیکن میدان سیاست بھی آپ سے محروم نہیں رہا۔ جمعیۃ العلماء کے آپ بہترین مشیر رہے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ گیا کے آپ صدر تھے۔ آپ کا خطبہ صدارت بہت مقبول ہوا۔[۱]

آپ کے آخری دور میں آئندہ کے لئے اہتمام کی بحث پیدا ہو گئی۔ آپ کا خیال تھا کہ آئندہ مہتمم مولانا محمد طیب صاحب خلف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ہوں دوسرے حضرات اس کے مخالف تھے۔ نتیجہ اگرچہ آپ کے موافق ہی رہا۔ مگر جماعت میں تفریق اور بد مزگی پیدا ہو گئی۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی وغیرہ دارالعلوم دیوبند سے استعفا دیکر علیحدہ ہو گئے۔ اور ڈابھیل ضلع سورت میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھدی۔ یہ تفریق اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے لئے عارضی طور پر مضر ہوئی۔ مگر احاطہ بمبئی جیسے علم سے خالی علاقہ میں ایک بہت بڑے مدرسہ کی بنیاد پڑ گئی۔ جو ایک برکت تھی۔

آپ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہمیشہ دست راست۔ بلکہ مختار مطلق رہے۔ اور حضرت حافظ صاحب موصوف کے زمانہ کی دارالعلوم دیوبند کی ترقی درحقیقت آپ کی رفاقت کی ہی برکت ہے۔

ان دونوں بزرگوں کے دور میں دارالعلوم کی ترقیات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے

---

[۱] یہ اجلاس گیا میں ۲۴ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہوا تھا جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے جمعیۃ العلماء ہند کے گیا ہو رہی اجلاس منعقدہ ... میں ایک تقریر کے ضمن میں فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے وصیت فرمائی تھی [illegible]

کہ صرف تعمیرات اور کتب خانہ کے سلسلہ میں تقریباً آٹھ لاکھ کی مالیت کا اضافہ ہوا۔
حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم
قرار دئے گئے۔

رجب ۱۳۴۸ھ میں آپ نے اس جہان فانی سے ہجرت فرمائی۔ اور ہمیشہ
کے لئے دارالعلوم دیوبند کو اپنا مداح چھوڑا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ وقدس سرہٗ

# امام العصر سیدنا حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری

خاکسار حضرت موصوف کا ایک ادنیٰ تلمیذ ہے۔ حضرت والا کی جلالت شان احقر کے قلم کو مرعوب کر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کے صاحبزادہ والا جاہ مولانا ازہر شاہ صاحب "قیصر" نے بروقت احقر کی امداد فرمائی۔ اور خود اپنے قلم سے حضرت موصوف کے حالات "قلمبند" فرمادئے۔ جو صاحبزادہ موصوف کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

حضرت علامہ جلیل رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہال میں بمقام موضع دودھواں (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے ۴ ½ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد معظم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک شروع کیا۔ اور چھ برس کی عمر تک قرآن شریف کے علاوہ فارسی کے متعدد رسائل بھی ختم کر لئے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب (صوفی پورہ) سے فارسی وعربی کی تعلیم حاصل کی اور ابھی آپکی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی کہ ۱۳۰۵ھ میں شوق تعلیم نے لولاب کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں پر غریب الوطنی کی علمی زندگی پر ترجیح دی۔

چنانچہ تین سال تک آپ ضلع ہزارہ (پنجاب) کے متعدد علما وصلحا کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے۔ پھر جب علوم وفنون کی پیاس وہاں بھی بجھتی نظر نہ آئی تو ہندوستان کے مرکز علوم دینیہ دارالعلوم دیوبند کی شہرت سنکر آپ بھی ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند روانہ ہوگئے۔ دیوبند میں آپنے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیر وقت ویکتائے روزگار علما

سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجہ اتم استفادہ کیا۔ اور ۲۰۔۲۱ سال کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سند فراغ حاصل فرمائی۔ جن علماء سے آپ کو شرف تلمذ رہا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:۔

قدوۃ العلماء حضرت مولانا الحاج محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔ حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی الدیوبندی۔ دیوبند سے فارغ ہو کر آپ قطب الارشاد حضرت مولانا الحاج رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لیگئے۔ اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کئے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لیگئے۔ اور تین چار سال تک مدرسہ عالیہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں بارہ تیرہ سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لیگئے۔ اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں طرابلس۔ بصرہ۔ اور مصر و شام کے جلیل القدر علماء نے آپکی بہت عزت کی اور سب نے آپکی خداداد و بے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں۔ جن میں آپ کا نام "الفاضل الشیخ محمد انور بن المولانا محمد معظم شاہ الکشمیری" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام ہے) خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی قصبہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیضیاب

فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپکو دارالعلوم دیوبند کے مشہور جلسۂ دستار بندی میں مدعو کیا گیا اور آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم میں آپ نے استفادۂ علوم وفنون کیا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی اب اسی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہو گئے۔ سنن ابوداؤد شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک آپ بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے چند سال کے بعد آپکو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جانا پڑا۔ لیکن دارالعلوم کی طرف سے واپسی کا شدید تقاضا ہوا۔ اس لئے جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے بہت زیادہ شفیق استاذ تھے اور ساتھ ہی آپکا بہت زیادہ احترام بھی فرماتے تھے۔ وہ اکثر دیوبند میں آپکے مستقل قیام کی تجاویز سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور پھر اتباعاً للسنۃ لسنیۃ النبویۃ نکاح کی تاکید فرمائی۔ یہ ۱۳۳۶ھ کا واقعہ ہے جب آپ کی عمر شریف ۴۴ سال کی تھی۔

بظاہر حضرت شاہ صاحب کو مجرد ہی رہنا بہت زیادہ پسند تھا۔ اور آپ شادی کے لئے بالکل آمادہ نہ تھے لیکن بسبب اتباع سنت نبوی اور اپنے مشفق ومحترم استاد کی خواہش واصرار پر بادل ناخواستہ رضامندی ظاہر فرمائی۔ اور جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم کے حسن انتظام سے گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک اعلیٰ اور معزز وشریف خاندان میں آپ کی شادی ہو گئی۔ اس سے پہلے آپ دارالعلوم میں حسبۃً للہ درس دیتے تھے اب شادی کے بعد بسبب حوائج اہل وعیال نہایت قلیل تنخواہ قبول فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے سلسلہ میں آپکو بیشتر ہندوستان کے اکثر

مقامات میں جانا پڑا ہے۔ اور جہاں جہاں آپ تشریف لیگئے ہیں وہاں سے دار العلوم کی امداد و اعانت میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ دار العلوم کا وفد نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر نواب آف ڈھاکہ کی خدمت میں گیا حضرت شاہ صاحب رئیس الوفد تھے۔ اور آپ نے عربی زبان میں نواب صاحب کو نہایت فصیح و بلیغ ایڈریس دیا جس سے نواب صاحب مرحوم پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور وفد مذکور نہایت کامیاب ہو کر واپس ہوا۔ وھکذا۔

۱۳۴۶ھ تک آپ دار العلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند درس حدیث دیتے رہے۔ اس کے بعد جب منتظمین دار العلوم سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوا، تو آپ نے دار العلوم سے قطع تعلق فرمالیا۔ اور آپ قطب عالم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی رح۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی رح۔ مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور بہت سے علما اور کئی سو طلبا کی ایک جماعت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۲ صفر المظفر ۱۳۵۱ھ کو شب کے آخری حصہ میں آپ نے دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا اور کئی سال کی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجودہ سیاسی خلفشار میں جمعیۃ علماء ہند کے مسلک کے بہت بڑے حامی بہت بڑے حریت پسند برطانوی امپیریلزم کے سخت دشمن اور ہندوستان میں دین قیم کو سربلند دیکھنے کے آرزومند تھے۔ شروع سے

اخیر تک آپ جمعیۃ علما کی مجلس عاملہ کے اعلیٰ رکن اور جمعیۃ کے مقاصد کے ہمدرد رہے۔
ہمیشہ آپ نے اپنے گرانقدر مشوروں سے جمعیۃ کی رہنمائی اور جمعیۃ کے حلقہ کو وسیع
کرنے کی کوشش فرمائی بتاریخ ۱۳۴۶ھ میں حضرت مرحوم نے پشاور میں جمعیۃ کے آٹھویں
عظیم الشان اور تاریخی سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے ایک بصیرت افروز اور
معرکہ آرا خطبہ میں بہت سے مذہبی اور سیاسی موضوعات پر اپنے گرانقدر خیالات کا
اظہار فرمایا تھا۔ مبصرین کا خیال ہے کہ آجتک جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر ایسا قیمتی خطبہ
نہیں پڑھا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ خیال صحیح ہے۔ جمعیۃ کے علاوہ مجلس احرار کے
حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشہ چشم التفات مبذول رہا۔ اور اس کے قائدین کی بھی
حضرت مرحوم نے اپنے علم وفضل اور روحانی قوت سے قیادت ورہنمائی فرمائی۔
تحریک کشمیر میں احرار کو حضرت مرحوم کی تمام ہمدردیاں حاصل تھیں۔ علامہ مرحوم
کو دور حاضر کے مہلک ترین فتنہ قادیانیت کے رد سے غیر معمولی شغف تھا۔ سالہا
سال تک علامہ مرحوم اس فتنہ کی ہلاکت سامانیوں سے ملت مرحومہ کو محفوظ فرمانے
کے لئے تحریری و تقریری طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ تردید قادیانیت کی سلسلہ
میں آپ انتہائی پریشان کن علالت کی حالت میں بھی مذہبی جلسوں میں شرکت کے
لئے دور دراز کا سفر فرماتے تھے۔ انتہا یہ کہ انتقال سے صرف چند دن پہلے آپ
اپنی مشہور و معرکہ آرا تصنیف "خاتم النبیین" سے فارغ ہوئے تھے۔ جس میں آیہ
کریمہ وماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم
النبیین کی آپ نے اپنے مخصوص محدثانہ اور محققانہ رنگ میں تفسیر فرمائی ہے۔
یہ تصنیف محض قادیانیوں کے دجل وتلبیس کے تار و پود کو بکھیرنے کے لئے فرمائی گئی

تھی اس سے فراغت پاکر حضرت مرحوم نے اپنے خدام سے ارشاد فرمایا کہ

میں نے آخرت کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ خاتم النبیین کے عنوان
سے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ انشاء اللہ یہ مرزائے قادیان کے دجل
و فریب کو اظہر من الشمس کر دیں گی اور میرے لئے زاد راہ آخرت
ہوں گی؛

مجلس احرار کو حضرت مرحوم نے رد قادیانیت پر متوجہ فرمایا۔ احرار نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے قابل قدر سرگرمی کے ساتھ جہاد کیا۔ اور اس کے ناپاک اثرات کو بہت حد تک ختم کر کے اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال ؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا واقفین حال اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ ؒ کی برکات تھیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اسلامیات میں علامہ مرحوم سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اور علامہ مرحوم کے فیض صحبت نے ان کی روح کو جلا بخشی۔ ڈاکٹر موصوف دل و جان سے علامہ مرحوم کا احترام کرتے تھے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ علامہ کی رائے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

حضرت کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپکو اقران و اعیان عصر میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی وہ آپ کی جامعیت و تبحر فی العلوم ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے۔ جس میں آپکو مہارت تامہ حاصل نہ ہوا۔ اور شاید یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ علمائے متقدمین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستی مشکل سے نظر آئے گی۔

آپ سیکڑوں علماء وفضلا کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک علم وفن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے۔ کہ گویا آپکو تمام مسائل فن مستحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ آپ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ الہامات وارادات کے زور پر کہہ رہے ہیں اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا کہ اکابر علماء وقت سے جب بعض دقیق اور لاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرتؒ سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔

اور اکثر علماء عصر حاضر کو جب کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت مرحوم سے مراجعت فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی مدظلہٗ کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے جو انہوں نے حضرت مرحوم کو ارسال فرمایا تھا جس میں انہوں نے کسی مسئلہ پر حضرت مرحوم سے تحقیق چاہی ہے۔
نفحۃ العنبر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے عربی زبان میں حضرت مرحوم کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے مرتب اور مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامت نے اکثر مسائل میں علامہؒ مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔

---

از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ بخدمت با برکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب دامت انوارہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے ایک حادثہ خود مجھکو پیش آیا۔ اس کے متعلق جداگانہ تکلیف دیتا ہوں الخ وقال فی خاتمۃ اس میں روایت یا درایت سے کچھ حکم فرمائیں۔"

حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی و جامعیت فنون نہ صرف ہندوستان میں مسلم تھا بلکہ
مصر و شام بیروت حرمین شریفین و دیگر بلاد اسلامیہ کے بھی جو علما ہندوستان بغرض
سیاحت آتے تھے اور دارالعلوم میں پہنچکر آپ سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے تھے وہ
آپ کی بے نظیر علمی قابلیت کے معترف ہوکر جایا کرتے تھے اور اکثر نے کہا کہ ہمارے ملک
میں کوئی ایسا جامع و محقق عالم نہیں۔

پچیس سال ادھر کی بات ہے۔ مصر کے مشہور عالم و ادیب علامہ سید رشید رضا
مدیر رسالہ "المنار" جو مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید تھے۔ ندوۃ العلمار لکھنؤ کے سالانہ
جلسہ میں ہندوستان تشریف لائے۔ سید رشید رضا مرحوم دارالعلوم میں بھی آئے
اور آپ نے وہاں کا بھی معائنہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے طلبا وارکین مدرسہ اور
اعیان شہر کے جلسہ عام میں اس موقع پر عربی زبان میں ایک مبسوط تقریر فرمائی جس میں
آپنے اولاً دارالعلوم کی اجمالی تاریخ بیان فرمائی۔ پھر درس حدیث شریف کا جو طریقہ دارالعلوم
میں رائج ہے اسکو واضح فرمایا۔ نیز حنفیہ کے مسلک کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش فرمایا۔
اور اس کے اصول اساسی پر کافی روشنی ڈالی۔ جس سے رشید رضا مرحوم بہت زیادہ
محظوظ ہوئے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی قوت بیان اور استدلال اور وسعت معلومات
پر سخت متحیر۔ نیز علامہ رشید رضا مرحوم نے شافع المذہب ہونے کی وجہ سے مذہب حنفی کے
متعلق آپ سے بہت سے سوالات بھی کئے جن کا حضرت نے کافی وشافی جواب مرحمت فرمایا
سید رشید رضا علامہ محترم کی ملاقات سے اسقدر محظوظ ہوئے کہ آخر انہیں
یہ کہنا پڑا ہے۔ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت
مایوس ہوکر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجکو بتا دیا ہے کہ

ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں"
سید موصوف جب واپس مصر پہنچے تو آپ نے رسالہ المنار میں جس کی مصر کی صحافتی طبقہ میں بہت زیادہ قدر و منزلت تھی۔ دارالعلوم کی عموماً اور علامہ سید انور شاہ کے تبحر علمی و جامعیت کی خصوصاً بہت تعریف فرمائی اور آپ کی عربی تقریر بحیثیت تحقیق و بلحاظ عربیت نہایت شاندار الفاظ میں تقریظ فرمائی۔

علامہ موسیٰ جارا للہ روسی اسلامی دنیا کے زبردست عالم اور وسیع النظر فاضل ہیں۔ ان کی علمی شخصیت عالمگیر شہرت کی مالک ہے۔ آٹھ سال گذرے جب علامہ موسیٰ دیوبند تشریف لائے تھے آپ کئی دن تک علامہ مرحوم سے علمی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اور اخیر میں آپ نے علامہ مرحوم کے تبحر علمی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا حافظہ زبان زد خلائق ہے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو آپ کو یاد ہوتے تھے۔ حوالہ جات کتب صحیحہ بقید جلد و صفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اور اُن کی صحت اور عدم صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں۔ رواۃ کے مدارج و مراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبہ حدیث اکثر آپکی خدمت میں حاضر ہو کر ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں لیتے جن کی تحقیق و جستجو کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے۔ پھر ہر جواب میں جامعیت اسقدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ مشہور و معروف کتبخانوں کی اکثر مخطوطات (قلمی کتابیں) نظر سے گذر چکی تھیں۔ اور اس

طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی مطالعہ کیا ہے،

آخر عمر میں بیماری کا بہت زیادہ غلبہ رہا جس سے ممکن تھا کہ حافظہ پر اثر پڑتا۔ مگر فضل ایزدی سے آپ کو یہ عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ حالانکہ بہت سے کامل محدثین کے حافظہ میں آخر عمر میں اختلاط آ گیا تھا۔ اس اعتبار سے آپ آیۃ مین آیات اللہ تھے۔

جزئیات فقہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی اکثر بیت آپکو محفوظ تھیں۔ مگر حضرت باوجود اس کمال فقاہت و حفظ کے اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں۔ اور کسی کی تقلید نہیں کرتا۔ لیکن فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا اور اس میں امام اعظم کا مقلد ہوں۔

علم حدیث میں جو کچھ آپ کا مرتبہ ہے وہ سبکو معلوم ہے اس فن مبارک میں اللہ تعالےٰ نے وہ کمال آپ کو عطا فرمایا تھا کہ عرب و عجم میں اسکی نظیر مشکل بلکہ قریبا ناممکن ہے کمال حافظہ کی وجہ سے علاوہ صحاح ستہ کے دیگر کتب مبسوطۂ حدیثہ مطبوعہ و قلمی آپکو از بریاد تھیں۔

مرحوم کا یہ تبحر صرف علوم حدیث و تفسیر و اصول فقہ تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں حضرت کو یہی کمال حاصل تھا۔ کسی فن کی کوئی کتاب ملی اور اسکو شروع سے آخر تک ایک بار ضرور مطالعہ فرما لیا۔ اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرما دیا کہ سننے والے ششدر و حیران رہ گئے۔

ایک بار پنجاب سے ایک صاحب علم جفر کے متعلق چند مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے۔ آپ نے انکو تسلی بخش جواب

عنایت فرما کر واپس فرمایا۔ فلسفہ جدید (جدید سائنس) اور جدید ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ اور اپنے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔

حضرت نے علم طب کا بھی بتمام و کمال مطالعہ کیا تھا۔ اور جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب کو علم طب کی کتابیں پڑھائیں جو اس وقت دیوبند میں ایک نہایت کامیاب مطب کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ میں علمی تبحر و کمالات ظاہری و باطنی کے ساتھ زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ جس طرح آپ علم و فضل میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے اسی طرح آپ زہد و تقویٰ، ورع و پرہیزگاری میں بھی بے مثل تھے۔

آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں۔ لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہوں کو ترجیح نہیں دی۔ اور ہمیشہ دیوبند و ڈابھیل کے خشک خطوں ہی کو پسند فرمایا۔

بچپن میں آپ کو لہو و لعب اور فضول و بیکار باتوں سے سخت نفرت رہی اور زمانہ جوانی میں کبھی کوئی خفیف سے خفیف بات بھی ایسی صادر نہیں ہوئی جو بمقتضائے سن عموماً ہوا کرتی ہے۔ منہیات شرع تو کیا مشتبہات سے بھی ہمیشہ اس طرح شدت سے اجتناب و احتراز فرمایا کرتے تھے کہ گویا ایک مجدد اسلام اپنے طریق عمل سے شریعت حقہ پر ثابت و قائم رہنے کی عملی تلقین کر رہا ہے۔

ابتدائے عمر ہی سے تجرد و تفرد اور دنیاوی امور سے یکسوئی کو نہ صرف

پسند فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اس جہان علم و عمل کی اس مختصر تاریخ حیات کو ہم حکیم الامت حضرت قبلہ مولانا اشرف علی صاحب مدظلہٗ اور شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ارشادات پر ختم کرتے ہیں۔

زعیم احرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل حضرت

مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود بھی ہے اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔"

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا کہ: "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن

حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزیز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کرکے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے! کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو انکی خصوصیات کے حامل ہونیکی وجہ سے انکے ہی مرتبہ میں ہوتے اور آپکے تذکرے بھی انہی کی طرح مدتوں کئے جاتے۔ اسی وجہ سے میں خیال کرتا ہوں کہ گویا حافظ ابن حجر شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہوا ہے۔"

انا العبد الضعیف الحقیر العلیل قیصر وفقہ اللہ لما یحبہ و یرضاہ لیلۃ یوم السبت ثامن ربیع الاول ۱۳۵۳ھ۔ شاہ منزل دیو بند

حضرت علامہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ اجلاس ہشتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ
۲/۳/۴ راکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء مطابق ۶۔۷۔۸ جمادی الاخری سنہ ۱۳۴۶ھ بمقام پشاور
کے صدر تھے۔ اس زمانہ میں شدھی سنگھٹن اور ہندو مسلم بلووں کے طویل سلسلہ
نے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ تفرقہ بندی کے اس پر آشوب دور میں حضرت
محترم موصوف کے سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے خطبہ صدارت کے چند اقتباسات
درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

**حب وطن کی شرعی حیثیت** | ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے۔ اسی طرح
مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے
صدیاں گذر گئیں۔ انہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان
کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے
آب و گل سے ہے ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں
روپیہ کی جائیدادیں ہیں۔ اعلیٰ شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک
ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے۔ جیسے ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہئے
اور کیوں نہ ہو۔ جب کہ ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ۔ اپنے محبوب آقا صلی اللہ
علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہو کر حکم خداوندی کے ماتحت اپنے پیارے وطن مکہ
معظمہ سے ہجرت کے بعد وطن عزیز کو خطاب کرکے فرمایا تھا۔

"خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے۔ اور اگر میری
قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔" اس کے بعد جب حکم الٰہی سے

آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دار الہجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا۔ اس لئے گویا مدینہ طیبہ آپ کا وطن ہو گیا۔ اور اس میں بحیثیت وطن رہنا تھا۔ اس کے لئے دعا فرمائی

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد۔ — بار خدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنا دے جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ محبت دیدے۔ اے اللہ ہمارے صاع[1]، ہمارے مد اور ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت سے دوچند برکت عطا فرما۔

اللھم بارک لنا فی صاعنا وفی مدنا وفی تمرنا ضعفی ما جعلت بمکۃ من البرکۃ

اللھم ان ابراھیم عبدک وخلیلک دعاک لاھل مکۃ بالبرکۃ وانا محمد عبدک ورسولک ادعوک لاھل المدینۃ ان تبارک لھم فی مدھم وصاعھم مثلی ما بارکت لاھل مکۃ مع البرکۃ برکتین — خداوندا آپکے بندے آپکے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپسے مکہ والوں کیلئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ اور تیرا رسول محمد ہوں اہل مدینہ کیلئے تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ انکے مد اور صاع میں اُس برکت سے جو اہل مکہ کو عطا فرمائی دوچند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کیساتھ دو برکتیں نازل فرما۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور اُن کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبہ حب وطن سے خالی ہو۔ اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ اُنکو بھی طبعی طور پر اپنے وطن ہندوستان سے محبت

---

[1] "صاع" اور "مد" پیمانوں کے نام ہیں۔ صاع میں ۳ سیر ۶ چھٹانک گیہوں آتے ہیں اور مد صاع کا چوتھائی ہوتا ہے۔

ہونی چاہئے۔ اس لئے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے۔

(۲) افغانی خطرہ کا حل | یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا۔ نہایت پست خیال ہے۔ اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہوں گے اور ہمسایہ کی تعدی کا شکار نہ ہوں گے۔ تو ان کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے[1] اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہو۔ اس سے زیادہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ کہ جب مسلمانان ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے ان کا معاہدانہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہبًا اسکی اجازت نہیں کہ مسلمانان ہند کے معاہدہ کو توڑے۔ اور ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ بلکہ اسپر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانان ہند کے اس معاہدہ کا پورا پورا احترام کرے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| ذمۃ المسلمین واحدۃ یسعی بھا ادناھم | مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے۔ ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرلے تو دوسروں پر اس کا احترام لازم ہے۔ |

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| کل صلح جائز الا صلحا احل حراما او حرم حلالا | یعنی سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ ہر قسم کی صلح جائز اور درست ہے |

[1] کیا اس کے معنی "متحدہ قومیت" نہیں۔ اب ملاحظہ فرمایئے۔ سیدنا شیخ الہند مولانا سید حسین احمد صاحب کی تصنیف "اسلام اور متحدہ قومیت"

میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادران وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کریں اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مسلمان حکم قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

الا الذین عاهدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاهروا علیکم احدا فاتموا الیهم عهدهم الی مدتهم۔ ان الله یحب المتقین۔

جن غیر مسلمانوں سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے ایفاء عہد میں تمہارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت رکھتا ہے۔

وقال ایضاً

فما استقاموا لکم فاستقیموا لهم ان الله یحب المتقین

جب تک وہ (غیر مسلم) تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو۔ بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) دارالاسلام۔ دارالحرب دارالامان

اس موقعہ پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے جس کے پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اول جو اسلامی حکومت اور اسکی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔ دوسرے جو "دارالامان" کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو "دارالحرب" میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان

کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ العزیز نے تصریح فرمادی ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا یہ فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیت کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں (اہل علم تفصیل کے لئے "درمنتقی" کے اس باب کو ملاحظہ فرمائیں۔ جس میں اختلاف دار کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

دارالامان کے احکام کی جانب کچھ اشارہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے معاہدہ کی جانب توجہ دلاؤں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء زمانہ ہجرت میں مسلمانوں اور یہود کے ساتھ کیا تھا۔

(خطبہ میں اس معاہدہ کی ۱۹ دفعات بیان کی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں صرف ان دفعات کو (بلفظہ) ذکر کریں گے جن کا تعلق غیر مسلموں سے ہے (محمد میاں)

(۱) یہ تمام معاہد جماعتیں (مہاجرین۔ انصار۔ یہود معاہدین) دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں۔ ایک جماعت اور ایک قوم شمار ہوں گی۔

(۲) خداوند تعالیٰ کی پناہ۔ اور ذمہ داری اور عہد ایک ہے۔ اگر کسی ایماندار بندے نے کسی کو خدا کی پناہ دیدی تو دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کا پورا کرنا لازم ہے خواہ وہ پناہ دینے والا ادنیٰ ہی درجہ کا مسلمان کیوں نہ ہو۔

(۸) جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے۔ ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات (ہمدردی) کا برتاؤ کریں۔ اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔ اور نہ ان کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔
(۱۱) مسلمانوں کو پابندی عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا۔ اور ارفع ترین مکارم اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔
(۱۵) یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں۔ یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔ ہاں جو ظلم اور عہد شکنی یا کوئی جرم کرے گا وہ اس کی جزا کا مستحق ہوگا
(۱۶) اگر مسلمان یا یہود معاہدین کے برخلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا ہوگا۔ اور مسلمان لشکر اپنے مصارف کا اور یہود لشکر اپنے مصارف کا ذمہ دار ہوگا۔
(۱۸) اپنے پڑوسیوں کو اپنی جان کی برابر سمجھو۔ بشرطیکہ وہ پڑوسی بھی مضرت رسانی اور جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔

اس معاہدہ کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک عالمانہ بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

علمائے احناف نے اس معاہدہ کو سامنے رکھکر دارالحرب اور دارالامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے ہیں۔

فقہائے احناف نے دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دیکر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے۔ مثلاً

عصمت (تحفظ) کی دو قسمیں ہیں (۱) عصمت موثمہ۔ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے کو گناہ تو ہوتا ہے۔ مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا۔ (۲) عصمت مقومہ یعنی اس کے توڑنے والے پر اس نفس معصومہ کا بدل بھی واجب ہوتا ہے۔

اب عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا جائے تو قاتل کے لئے جزاء جہنم کی وعید تو بہر حال لازم ہے خواہ دارالحرب میں قتل ہو یا دارالاسلام میں۔ البتہ دیت یا قصاص وغیرہ کے احکام اسلامی شریعت کے بموجب جب ہی عائد ہوں گے جب کہ دارالاسلام میں ہو۔

مختصر یہ کہ عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر عصمت مقومہ کے لئے دارالاسلام اور حکومت و شوکت اسلامیہ کا ہونا شرط ہے۔

اس بحث کے خاتمہ پر حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے۔ اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں ص۲۷ خطبہ صدارت

یہ علمی بیش بہا خطبہ صدارت ۸۲ صفحات پر ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبہ سرحد کے مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں۔ آخر میں عربی قصیدہ ہے جس کے آخری دو شعروں پر ہم حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کی تحریرات کو

| | |
|---|---|
| وآخر دعوانا ان الحمد للذی | ھدانا لھذا ارشد الی مرشد |
| صلوۃ و تسلیم علی خیر خلقہ | ختام جمیع الانبیاء محمد |

# حضرت علامہ استاد مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے برادر بزرگ تھے۔ تقدس طہارت۔ زہد و عبادت سادگی مزاج۔ تبحر علمی میں مخصوص جلالت و عظمت اور مخصوص سیرت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کے خلیفہ اعظم تھے۔ طریقت اور سلوک کے ماہر تھے۔ سیکڑوں مشتاقان طریقت نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

مدرسہ میں تدریس کے ساتھ۔ افتاء کی جلیل الشان خدمت انجام دیتے تھے۔ سفر اور حضر میں دستا ویے کا گڈا۔ آپ کے پاس رہتا۔ جب بھی موقعہ ملتا تحریر فرمانا شروع کر دیتے۔

تقریبًا اٹھارہ ہزار فتاوے آپنے اپنے زمانہ میں تحریر فرمائے

آپ کے بعد دار العلوم دیوبند کو آپ جیسا مفتی اب تک میسر نہیں آیا۔ اور مستقبل قریب میں کوئی توقع بھی نہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

جناب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین دہلی۔ آپکے خلف اکبر ہیں۔ دوسرے صاحبزادے حافظ حاجی جلیل الرحمٰن صاحب ہیں۔ خدا وند عالم دونوں کو دارین کی سعادت اور عظمت عنایت فرمائے آمین
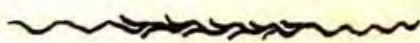
# دار العلوم دیوبند کا دور حاضر

## اکابر

سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

استاد محترم حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی عرف حضرت میاں صاحب مدظلہ العالی

حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ صدر مہتمم دار العلوم دیوبند مدظلہ العالی

حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ مدظلہ العالی۔

سیدی الاستاذ حضرت علامہ الحاج الحافظ الادیب مولانا محمد اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ

واستاذ الادب دار العلوم دیوبند

حضرت الاستاذ العلامہ مولانا عبد السمیع صاحب استاذ دار العلوم دیوبند مدظلہ العالی۔

ان میں سے سب ہی حضرات مکمل تاریخ کے مالک ہیں۔ مگر ہم اسکو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کرتے ہوئے اس وقت صرف سیدنا الجلیل حضرت شیخ الہند ثانی کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ انیب

# سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند

## از الشمس برکاتہ بارغہ

سیاست ہائے ہندی کا نشاں ہے ذات سے تیری
یہ کشتی اس بحیرہ میں رواں ہے ذات سے تیری

اسیر مالٹا کی جانشینی تجھ کو حاصل ہے
سحاب حریت گوہر فشاں ہے ذات سے تیری

غلاموں کو سکھا دے آج آئین جہاں بانی

---

کیا ہے فخر الدین رازی کی نکتہ سنجی۔ بوعلی سینا اور فارابی کی منطق۔ ابن حزم اور رشد کی حکمت؟ —— صرف ایک نتیجہ ہے ذکی الطبع افراد کی بر عافیت کتب بینی کا۔ کیا ہے ترک دنیا اور متقشفانہ تصوف۔ ایک خوشگوار جذبہ ہے دنیاوی جھگڑوں سے فارغ البالی کا بہت آسان ہے سالہا سال اعتکاف کے مکشفات اور مراقبات کی لطف اندوزی بہت سہل ہے۔ برسہا برس مطالعہ کتب کر کے تبحر علمی کے ملکات کی فراہمی بہت سہل ہے کسی خانقاہ کی کنج عزلت۔ بہت سہل ہے کسی دارالعلوم کی مسند تدریس۔

تم پوچھو —— مشکل کیا ہے —— ؟

میں بتاؤں گا بہت مشکل ہے۔ رجوع الی اللہ۔ زہد اور تقوی کے ساتھ خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی۔ یعنی وہ سوز۔ وہ گداز۔ وہ تڑپ۔ وہ بے چینی۔ جو کبھی مسجد میں لے جائے۔ کبھی حلقہ درس میں۔ کبھی ممبر پر وعظ و تلقین کے لئے کھڑا کرے کبھی سیاسی پلیٹ فارم پر ترقی ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے۔

پھر کبھی اپنوں کی گالیاں سنوائے اور کبھی پابزنجیر جیلخانوں کی سلاخوں میں

بند کرائے۔ دن کے وقت خدمت خلق میں مصروف اور پریشان رکھے۔ اور رات کی تاریکی میں محبوب حقیقی کے سامنے راہب شب بیدار بنا کر کھڑا کر دے۔

بلاشبہ بہت مشکل ہے ہمدردی خلق۔ اور غمخواری مسلم کی وہ خلش۔ جو رات کی میٹھی نیند حرام کر دے۔ مجلس احباب کو مجلس سوز وگداز بنا دے۔

افق پر صبح صادق کی کرن چمکے تو وہ توبہ و استغفار میں مشغول ہو۔ آفتاب کی پہلی کرنیں اسکو تسبیح و تہلیل میں مشغول دیکھیں۔ پھر اس کے تبلیغی۔ تعلیمی۔ مذہبی اور سیاسی مشاغل کو دیکھتے دیکھتے حیرت و استعجاب کے مغرب میں روپوش ہو جائیں۔ عالم پر تاریکی کی سیاہ چادر تانی جائے۔ تھکے ماندے انسان اپنی آرامگاہوں کی طرف دوڑیں اہل وعیال کی پر لطف چہل پہل سے دن بھر کی کوفت دور کریں۔ لیکن یہ مبتلاء سوز خلق اب بھی یا دور دراز کے سفر طے کر رہا ہو۔ یا عالی اور عمیق مضامین کے حل کرنے میں دماغ سوزی کر رہا ہو۔ یا مخلوق خدا کی تلقین میں مشغول ہو۔ یا اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود۔ گریہ و بکا۔ عجز و نیاز۔ مناجات و تلاوت۔ طویل قیام۔ طویل رکوع و سجود سے زاہدان خشک کے خلوتخانوں کو شرما رہا ہو۔

بیشک یہی ہے مشکل ترین سنت۔ یہی ہے انبیاء علیہم السلام کی سچی وراثت یہی ہے[1] مضمون حدیث کے بموجب سابق انبیاء علیہم السلام سے مشابہت۔ یہی شخص ہے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب۔ اسوہ صحابہ کا سچا پیرو۔ یہی ہے مصلح خلق۔

---

[1] شمائل ترمذی میں ارشاد ہے۔ افضلہم عندہ اعمہم نصیحۃ واعظمہم عندہ منزلۃ احسنہم مواساۃ وموازرۃً۔ یعنی صحابہ کرام میں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر میں وہ صاحب سب سے افضل ہوتے تھے۔ جنکی خیر خواہی مخلوق کے لئے زیادہ عام ہو اور بارگاہ رسالت میں اُن کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ جو غمخواری خلق اور خدمت خلق کے (باقی صفحہ آئندہ پر)

یہی ہے شیخ وقت۔ یہی ہے مرشد صادق۔ یہی ہے قطب عالم۔ اسی کی زندگی درس عبرت ہے۔ قابل اتباع بلکہ واجب الاتباع ہے۔

اچھا بتاؤ۔ دور حاضر میں کون ہے اس مقدس زندگی کا مالک اور اس مبارک سنت کا حامل و ماہر۔ وہی شیخ وقت قطب عالم۔ مرشد خلائق جس کا نام نامی اس تمہید کا مبارک عنوان ہے۔ یعنی

سیدنا و مرشدنا شیخ الہند ثانی شیخ الحرم حضرۃ علامہ مولانا سید حسین احمد صاحب۔ شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند۔ مد ظلہ العالی و دامت برکاتہ۔

دار العلوم دیو بند۔ اپنی قسمت پر جسقدر ناز کرے کم ہے کہ ہر زمانہ میں اُس کی صدارت کے لئے قدرت کے ہاتھوں نے مخلوق کا بہترین فرد منتخب فرمایا۔ آج بھی شیخ وقت دار العلوم دیو بند کا شیخ الحدیث ہے۔

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سر بلند
(ظفر علی خاں)

## شیخ الہند ثانی کی زندگی مبارک کے مختصر حالات

میں اس وقت اس گستاخی کو پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو میں نے مذکورہ بالا مضامین کے سلسلہ میں اکابر ملت کی شان میں کی۔ میں نے اپنی ناقص فہم۔ ناقص استعداد اور ناقص وقفیت کے ساتھ ایک مختصر فہرست میں ان حضرات کے حالات قلمبند کئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سلسلہ میں جفاکشی اور تحمل و برداشت میں سب سے بہتر ہوں (ملاحظہ ہو حدیث حسن بن علی میں رضی اللہ عنہما ص۲۴ شمائل ترمذی شریف) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ان المسلم اذا کان یخالط الناس و یصبر علی اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم (ترمذی شریف) ص۴۳ ج۲
یعنی وہ مسلمان جو لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔ اور ان کی اذیت پر صبر کرتا ہے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ کسی کی اذیت برداشت کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میں اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہا۔ اور ان حضرات کے شایان شان سیرت نہیں لکھ سکا۔ مگر میں اب اس گستاخی اور قصور کا عادی ہو گیا۔ لہٰذا اگر اپنی تمام کوتاہی ناواقفیت اور ناوانی کے ساتھ اس شیخ وقت کی مختصر سوانح حیات قلم بند کروں تو اگرچہ کوتاہی اور گستاخی ہوگی۔ مگر نئی نہ ہوگی۔

**ولادت باسعادت** ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ ۱۱ بجے شب شنبہ برج قمر بمقام قصبہ بانگرمؤ ضلع اناؤ۔ تاریخی نام چراغ محمد

**آبائی وطن** موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ۔ ضلع فیض آباد۔

**سلسلہ نسب** آپ حسینی سید ہیں۔ آپ کا خاندان تقریباً انیس پشت بیشتر ہندوستان میں آیا۔ والد ماجد حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب۔ سیدنا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے خلیفہ راشد تھے۔

۱۳۰۹ھ میں جب کہ عمر مبارک ۱۲ سال تھی۔ آپ کو دیوبند۔ سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی۔ خدمت میں بھیج دیا گیا۔ یعنی ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کیا گیا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کی فراست کاملہ نے اس سعادت عظمیٰ کو پہچان لیا۔ جس کے آثار بشرۂ مبارک سے نمایاں تھے۔

مخصوص شغف کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح تربیت شروع فرمائی۔ اپنی نگرانی میں رکھا۔ اور باوجودیکہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی خارجی اوقات میں کسی کتاب کے درس کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو ابتدائی کتابیں خود ہی پڑھائیں۔

صرف سات سال کے عرصہ میں جملہ علوم متداولہ سے فارغ ہوکر حضرت قطب العالم امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت بھی ہو گئے۔ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد قدس اللہ سرہ العزیز نے جملہ اہل و عیال سمیت بغرض ہجرت۔ بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا۔ تو آپ بھی ان کی رفاقت میں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔

امام ربانی مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مراحل سلوک طے کرنے کے لئے اپنے شیخ مرشد یعنی سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مہاجر مکی کی خدمت میں حاضری کا ایما فرمایا۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچکر مراحل سلوک حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیر تربیت طے کئے۔

حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چند ماہ حاضر رہکر دار ہجرت یعنی مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ جس سے چند ماہ بعد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے رحلت فرمائی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے جوار رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں رہکر وہ تمام فیض حاصل کئے۔ جو ایک باخدا انسان اس منبع الجود والکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے جوار مبارک سے حاصل کر سکتا ہے۔

**دور ابتلا** یہ پورا گھرانا مدینہ طیبہ پہنچا۔ تو رہائش کے لئے ایک مدنی صاحب نے مکان دیدیا۔ اور انہیں صاحب کے مدرسہ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے بصورت ملازمت تدریس شروع کردی

لیکن پھر کچھ ناگواریوں کی بنا پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو یہ تعلق

منقطع کرنا پڑا۔ اور مدنی صاحب موصوف نے مکان بھی خالی کرا لیا۔

اس عرصہ میں جو کچھ اثاثہ والد صاحب کے پاس تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اور فاقہ کی نوبت آنے لگی۔ تب حضرت والد صاحب نے اپنے تمام اولاد کو مخاطب کرکے فرمایا۔

میں مدینہ طیبہ میں ہجرت کر کے حاضر ہوا ہوں۔ آپ محض زیارت بیت اللہ کے لیے آئے تھے، جس سے فارغ ہو چکے۔ اب یہاں بسراوقات کی بظاہر کوئی شکل نہیں اس وقت کچھ تھوڑے بہت زیور یا کپڑے برتن وغیرہ اتنے ہیں کہ ان کو فروخت کرکے آپ کسی صورت سے ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے یہی ہے کہ آپ سب اپنے وطن چلے جائیں۔ میں یہاں مقیم رہوں گا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور جملہ متعلقین نے جواب دیا۔

خداوند عالم رزاق ہے۔ ہم فقر و فاقہ سے نہیں گھبراتے۔ شکم پری کی اگر کوئی صورت نہ ہو تو درختوں کی پتیاں کھا کر بھی اس سرزمین پاک میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مگر آپ سے اور اس ارض پاک سے مفارقت گوارا نہیں۔ بہر حال سب نے مدینہ طیبہ کو وطن بنا لیا۔

لیکن جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے (جنہوں نے حب رسول اللہ کا اظہار کیا تھا) فرمایا تھا "اگر تمہیں میرے سے محبت ہے تو فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جو جھول کی طرح تمہیں گھیرے گا۔"

اس گھرانے پر بھی فاقہ جھول بنکر آیا۔ چنانچہ متواتر چند ماہ اس حالت میں گذرے کہ ایک وقت میں تھوڑی سی مونگ کی دال میسر آتی تھی، جسکو پکا کر تھوڑی تھوڑی سب حضرات پی لیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

اس وقت اس گھرانے کے افراد کی تعداد ۱۳ - تھی - اور سب اس دور ابتلا میں اس قدر صابر و شاکر تھے کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوئی -

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے حرم اطہر میں درس دینا شروع کردیا تھا اسی فاقہ میں صبح سے شام تک درس کا مشغلہ جاری رہتا -

**پابندی اصول** | حضرت مولانا عبدالحق صاحب[ع] مدنی جو آجکل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مدیر ہیں - اس دور ابتلا کے راوی ہیں -

مدنی صاحب کے والد ماجد ترکی فوج میں ڈاکٹر تھے - اور اس کے علاوہ بھی مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر تھے -

ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مولانا عبدالحق صاحب مدنی کو بطور ٹیوشن تعلیم دیتے رہیں - لیکن عین اسی زمانہ میں جب کہ فاقہ کی یہ حالت تھی - حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ٹیوشن کو گوارا نہ فرمایا - البتہ اس کے لیے آمادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبتہ للہ جیسا کہ حرم اطہر میں اور طلبہ کو درس دیتے ہیں - مولانا عبدالحق صاحب مدنی کو بھی درس دیتے رہیں - طرفین سے یہ اصرار عجیب تھا - اور اسی میں تقریباً ۶ ماہ گذر گئے -

آخر کار ڈاکٹر صاحب - حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اصرار پر راضی ہو گئے اور مولانا عبدالحق صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب سے ابتدائی کتابیں شروع کر دیں -

---

ع آپکا آبائی وطن دیو بند ہے - آپ عثمانی شیخ ہیں - آپکے والد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب برطانوی فوج میں ڈاکٹر ہوکر افریقہ تشریف لے گئے تھے - وہاں سے بتقاضاء غیرت اسلام وحب دیار حبیب (صلے اللہ علیہ وسلم) فوج کی ملازمت چھوڑ کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے - اور وہیں سکونت اختیار کر لی - ترکی فوج میں ڈاکٹر ہو گئے - اور ساری زندگی رفاہیت اور خوش حالی سے بسر کی - مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی ولادت مدینہ طیبہ میں ہوئی وہیں (باقی آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

لطف یہ ہے کہ باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور آپ کے والد ماجد کے تعلقات اسقدر وسیع تھے مگر اندرونی فاقہ کی خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی ایک عرصہ کے بعد اس وقت ہوئی جبکہ وہ دور ابتلا۔ فراخی اور خوشحالی سے بدل چکا تھا۔

عجیب حقیقت یہ کہ عمر مبارک ہنوز تقریبًا اکیس سال ہے۔ یعنی خاص دور شباب ونشاط ہے۔

جس میں یہ اصول کی پابندی۔ یہ صبر وشکر۔ زہد وتقویٰ اور مجاہدات وریاضات جب کہ مکان خالی کیا گیا تھا۔ اور مدینہ طیبہ میں سب حضرات کے قیام کا ارادہ ہوا تو شہر سے باہر ایک قطعہ زمین لے لیا گیا تھا۔ اس میں مکان تعمیر کرنے کی صورت میں ایک دوسری سنت پر عمل ہوا۔ جس کی نظیر آپ حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کے حالات میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

یعنی عورتوں۔ بچوں اور مردوں نے مل کر اپنے ہاتھ سے اینٹیں پاتھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تعمیر کیں۔ جن کی چھت بقول مولانا عبدالحق صاحب مدنی اتنی نیچی کہ چارپائی پر کھڑے ہونے سے سر میں لگتی۔ اور اس طرح رہائش کے سلسلہ میں بھی سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسوہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر عمل ہوا۔ زہے قسمت

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا عبدالحق صاحب مدنی کا بیان ہے کہ اس ابتلا کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت شیخ اور آپ کے بھائیوں نے ایک عالیشان مکان مدینہ طیبہ میں

میں حرم اقدس کے قریب تعمیر کرایا۔ اس دور فراخی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک صاحب جو مہاجر تھے۔ اور عموماً حرم اطہر میں رہا کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے معتقد تھے۔ ان کی وفات ہوئی تو انہوں نے اپنا سرمایہ جسکی مقدار تقریباً چھ سو روپیہ تھی حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو دیدیا

حضرت موصوف اور آپ کے بھائیوں نے اس سے کھجوروں کی دکان کرلی۔ جس میں خداوند عالم نے برکت عطا فرمائی۔

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کے کچھ حالات تذکرۃ الرشید جلد دوم مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی (جو تحریک جمعیتہ العلماء کے شدید مخالف ہیں) کے الفاظ میں پیش کردیں۔

حضرت مولانا الحاج المولوی حسین احمد صاحب مہاجر مدنی مدت فیوضہ نے ۱۳۱۶ھ میں حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب سے بیعت ہوکر والد اور برادران[1] کے ہمراہ جد امجد کے بلدہ طیبہ (مدینہ منورہ) میں اقامت اختیار کی مکہ معظمہ پہنچکر حسب اجازت امام ربانی قدس سرہ۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے رجوع کیا۔ اور اذکار تعلیم فرمودہ قطب العالم پر بھی بہت تمام کار بند رہے

[1] بڑے بھائی کا نام مولانا محمد صدیق صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ آپنے بھی دیوبند میں دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اوائل ۱۳۱۲ھ میں امام ربانی سے بیعت ہوکر کئی سال مجاہدات وریاضات نفس میں مصروف رہے ۱۳۱۸ھ میں دوبارہ ہندوستان تشریف لاکر گنگوہ حاضر ہوئے عرصہ ہوا آپ کی وفات ہوچکی ہے۔ آپ کے صاحبزادہ مولانا وحید احمد صاحب مدنی تھے جو حضرت شیخ الہند کی رفاقت میں مالٹا میں اسیر رہے۔ مگر افسوس دو سال ہوئے آپکی بھی وفات ہوچکی۔ مولانا وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے عزیز محترم مولوی فرید احمد صاحب آجکل تعلیم پا رہے ہیں، خداوند عالم دارین کی سعادت اور آبا کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

اس زمانہ میں جو کچھ واردات عجیبہ و کیفیات غریبہ ظاہر ہوئیں ان کی اطلاع گنگوہ میں آستانہ علیہ پر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۶ھ میں حضرت کا والا نامہ پہنچا کہ چند روز کے واسطے گنگوہ آکر مجھ سے مل جاتے تو بہتر ہوتا۔ اس فرمان والاشان پر مطلوب بنکر باوجود تنگدستی و بے سروسامانی کے مراجعت ہندوستان کا تہیہ کر لیا۔ باپ کا باقتضائے محبت جی چاہا کہ بھائیوں میں کوئی ایک رفیق سفر ہوتا تو اچھا تھا چھوٹے بھائی مولوی سید احمد صاحب جو اُن کے دو چار مہینے آگے پیچھے سلسلہ خدام میں داخل ہوئے تھے۔ غلبہ شوق کے سبب فرضی ضروریات ذاتی و خانگی قائم کرکے باپ سے ہمراہی برادر کی اجازت بھی لے چکے تھے۔ مگر قدرت کو منظور رہی کچھ اور تھا۔ بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب در پردہ خفیہ انتظام کرکے چھپکر چند روز پہلے روانہ بھی ہو لئے۔ جس کی اطلاع بارہ گھنٹہ بعد قریب مغرب ہوئی۔ مجبوراً مولانا سید احمد صاحب کو ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ اور مولانا حسین احمد صاحب تنہا روانہ ہوئے جدہ میں دونوں بھائی مل گئے۔ اور حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر گنگوہ پہنچے چند

---

لے آپ مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں۔ آپ نے وہاں حرم اطہر میں "مدرسہ الایتام" قائم کر رکھا ہے۔ جس میں دینیات کی تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے — حجاز مقدس میں آپ کی ذات بہت غنیمت ہے۔ اہل مدینہ خاص طور پر آپکا احترام کرتے ہیں اور آپ نے اپنی زندگی اہل حجاز کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ ادام اللہ برکاتہم۔ آپ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے بڑے ہیں۔ خود حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ ہم پانچ بھائی تھے (۱) مولانا محمد صدیق صاحب آپکا سنہ ولادت ۱۲۹۰ھ تھا (۲) مولانا سید احمد صاحب ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے (۳) حضرت مولانا سید احمد صاحب سنہ ولادت ۱۲۹۶ھ۔ (۴) مولانا سید محمود احمد صاحب حضرت سے چھوٹے ہیں۔ جو کچھ عرصہ پیشتر جدہ میں قاضی و جج تھے۔ پانچویں بھائی مولانا سید جمیل احمد صاحب تھے۔ جو حضرت سے چھوٹے تھے۔ عرصہ ہوا وفات پا گئے۔

روز گذرے تھے کہ امام ربانی نے ایک ایک جوڑا یعنی ملبوس کرتہ اور پاجامہ دونوں بھائیوں کو عطا فرمایا۔ چونکہ اس میں ٹوپی یا عمامہ نہ تھا۔ اس لیئے دونوں میں سے کسی صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ارشاد ہو تو ہم خدام اپنا اپنا عمامہ حاضر کریں۔ اپنے دست مبارک سے عطا فرما دیا جائے۔ یہ سنکر حضرت نے سکوت فرمایا۔ اور بمقتضائے ادب دونوں بھائی عطیہ قطب العالم کو سر آنکھوں پر رکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اُٹھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں صاحب بلائے گئے۔ اور حکم ہوا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ اور جب دونوں صاحبوں نے اپنے عمامے حاضر کیئے تو حضرت امام ربانی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھکر ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟

مولانا محمد صدیق صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ "دستار فضیلت"

ارشاد ہوا۔ "دستار خلافت" امام ربانی قدس سرہٗ کی قولی و فعلی خلافت کے مجموعہ کی مثال میں آپ کے خلفاء کے اندر صرف یہی دو حضرات پیش کیئے جا سکتے ہیں۔ جن کے کمالات علمیہ و عملیہ اسی سے ظاہر ہیں کہ مدنی مہاجر اور بطحائی پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پڑوسی ہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کا درس حرم نبوی میں بحمد اللہ بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علماء کو کیا عنی یمنی اور شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

آپ سرتاپا خلق۔ مہمان نواز۔ غیور۔ باحیا۔ اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے (ص ۱۵۸ و ۱۵۹ ج ۲ تذکرۃ الرشید)

مختصر یہ کہ زائد سے زائد سے زائد ۲۲ سال کی عمر ہے کہ چشمہ رشد و ہدایت خود ہے ساقی کو بلا کر خلافت صادقہ کا خلعت عنایت فرما دیتا ہے۔ زہے قسمت۔

۱۳۱۸ھ کے مذکورہ بالا سفر کے بعد ۱۳۲۶ھ تک مسلسل جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام رہا۔ حرم پاک میں حلقہ درس روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ اور آپ صحاح ستہ اور تفسیر و فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کے تقریباً ۱۴-۱۵ سبق روزانہ پڑھاتے تھے۔ نماز صبح کے بعد سے سلسلہ درس شروع ہو کر عشا بعد تک رہتا۔

آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کرکے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ اور شیخ الحرم کے خطاب سے آپ معروف ہو گئے تھے۔

۸ سال بعد ۱۳۲۶ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ جمعیۃ الانصار اور موتمر الانصار اور دار العلوم کا جلسہ دستار بندی (جسکا ذکر پہلے گذرا) آپ کی جدوجہد کے رہین منت تھے۔

تین سال بعد آپ دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اگلے سال یعنی ۱۳۳۰ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ اور چند ماہ قیام فرما کر واپس مدینہ طیبہ میں تشریف لے گئے۔ اس موقعہ پر یہ تنبیہ کر دینی مناسب ہے کہ یہی زمانہ وہ ہے جب کہ انقلاب کی تجاویز ہندوستان میں شد و مد سے جاری تھیں اور جنگ یورپ کا آغاز ہو رہا تھا۔

۱۳۳۳ھ میں سیدنا حضرت شیخ الہند رح بھی ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے۔ فراغت حج کے بعد ۱۳۳۴ھ میں مدینہ منورہ تشریف لیگئے مشاغل درس برابر جاری رہے مگر اسی سال جمال پاشا۔ انور پاشا مرحوم مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور پھر کچھ عرصہ بعد عربی حکومت کا انقلاب ہو گیا۔ شریف نے بغاوت کی۔ اور پھر ۲۳ صفر شب یکشنبہ

۱۳۳۵ھ کو شریف حسین نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا عزیر گل۔ مولانا حکیم نصرت حسین مرحوم اور مولانا وحید احمد صاحب مدنی مرحوم کو گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

حضرت شیخ مولانا سید حسین احمد صاحب اس وقت شریف کی رعایا تھے۔ بہت ممکن تھا آپکو چھوڑ دیا جاتا۔ یا کسی اور طرح سزا دیدی جاتی۔ لیکن آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت کی از حد خواہش کی۔ بالآخر آپکو بھی جدہ پہنچا دیا گیا۔ جملہ اقارب۔ اعزہ۔ مکان سامان۔ بنام خدا مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں چھوڑا۔ اور تسلیم و رضا کی راہ میں خود کو امتحانات کے لئے پیش کر دیا۔ اسارت مالٹا وغیرہ کا بیان پہلے گذرا۔

والد ماجد اور بھائی صاحبان کو ترکی گورنمنٹ نے اپنی حراست میں اڈریانوپل پہنچا دیا۔ جہاں ان حضرات کو پورے اعزاز کے ساتھ رکھا گیا۔ حضرت والد ماجد اور مولانا محمد صدیق صاحب کی وفات وہیں ہوئی۔

بہرحال ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ موصوف جملہ رفقاء اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ کے ساتھ مالٹا سے رہا کئے گئے۔ اس اثنا میں آپ کے والد ماجد۔ بڑے بھائی۔ اہلیہ محترمہ اور برخوردار لخت جگر سب کے سب کچھ انقلابی مصائب اور کچھ امراض وغیرہ میں مبتلا ہو کر واصل بحق ہو چکے تھے۔ لیکن حضرت موصوف کے جوش حریت۔ اور جذبات اعلاء کلمۃ اللہ نے اب بھی اجازت نہ دی کہ براہ راست مدینہ طیبہ جائیں۔ بلکہ خلافت اسلامیہ کے بقا و تحفظ کے لئے ہندوستان میں جدوجہد کو مفید سمجھکر ہندوستان تشریف لائے۔ اور تحریک استخلاص وطن و تحریک خلافت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ لیکن اہل ہند کی بدقسمتی سے صرف پانچ

ماہ بعد حضرت شیخ الہند رح کی وفات ہوگئی۔

حضرت شیخ الہند رح کی وفات کے بعد دنیا نے آپکو حضرت شیخ الہند رح کا سچا جانشین سمجھا۔ اور حضرت موصوف نے (باوجود یکہ آپ کو اس لفظ سے بوجہ کسر نفس تکلیف ہوتی تھی) مذہبی اور ملکی خدمات کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد محض اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں یعنی اس فتوے کے سلسلہ میں جو کراچی میں حضرت موصوف کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ اور مولانا نثار احمد صاحب۔ مولانا محمد علی صاحب مولانا شوکت علی صاحب نے اُس کی تائید فرمائی تھی گرفتار ہو کر دو سال قید بامشقت کی مصیبت برداشت کی۔

کراچی سے رہائی کے بعد دنیا نے رہا ہونے والوں کے بڑے بڑے جلوس نکالے۔ مگر حضرت موصوف کا مخصوص طرز عجیب و غریب تھا۔ آپ جہاں تشریف لے گئے اچانک پہنچ گئے۔ کسی کو اطلاع بھی نہ ہو سکی کہ کب تشریف لائے۔

دیوبند میں شدید انتظار تھا۔ استقبال کے انتظامات بھی ہو رہے تھے۔ لیکن آپ شب کو ۲ بجے بالکل خاموشی کے ساتھ دیوبند ورود فرما ہو کر حضرت شیخ الہند رح کے مکان پر پہنچ گئے۔ صبح کو سنا گیا کہ رات حضرت جانشین شیخ الہند تشریف لے آئے۔

---

مالٹا اور پھر کراچی کی اسارت کے زمانہ میں آپ کے اہم ترین مشاغل صرف دو تھے (۱) قرآن پاک کا حفظ (۲) سلوک و طریقت کے مراحل طے کرنا۔

اسارت کراچی کے زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم نے آپ سے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھا۔ مولانا محمد علی مرحوم آپ کو چہیتا بھائی کہا کرتے تھے اور استاذانہ تکریمات سے

پیش آیا کرتے تھے

اس کے بعد تقریباً ۲ سال آپ سلہٹ "بنگال" میں ایک جامعہ اسلامیہ کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ گویا خداوند بالا و برتر نے صوبہ بنگال کی اصلاح کے لئے یہ غیبی تائید فرمائی تھی۔ اس تمام عرصہ میں تدریس کے علاوہ آپ کا بڑا مشغلہ اشاعت و تبلیغ تھا۔

حقیقت میں اُن مجاہدات کا تصور بھی انسان کو ہیبت زدہ کر دیتا ہے۔ جو حضرت موصوف کو وعظ و تبلیغ کے سلسلہ میں برداشت کرنے پڑے۔

بنگال کے دیہات جن کے ہر طرف ندیاں اور نالے۔ مگر آپ رات کے اوقات میں وعظ و تبلیغ کے سلسلہ میں پا پیادہ خطرناک جنگلوں۔ نالوں اور ندیوں کو طے کرتے ہوئے دیہات میں پہنچتے اور جتنے آدمی بھی جمع ہو سکتے اُن کو خداوندی احکام سناتے۔ ایسا بھی ہوا کہ سفر کی تمام کیچڑ اور دلدل کو طے کر کے جس جگہ پہنچے وہاں وعظ سننے والے صرف سات آٹھ آدمی ہی تھے۔ مگر آپ مجمع کی قلت سے کبھی بھی کبیدہ خاطر نہ ہوئے اور اُس ہی بشاشت کے ساتھ اُن کو اللہ کے احکام سنائے جس بشاشت سے ہزارہا کے مجمع کو سناتے۔

بہر حال اس مجاہدہ کا اثر بحمد اللہ بہت خوشگوار رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سارا ضلع سلہٹ آپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آپ کے اخلاص ایثار پر وارفتہ اور شیدائی ہو کر حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگا۔

سلہٹ اور اطراف سلہٹ کے رہنے والوں نے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے شرف بیعت حاصل کیا۔

۱۳۴۶ھ میں آپکے سامنے دارالعلوم دیوبند کی صدارت پیش کی گئی۔ جسکو آپنے دارالعلوم کے مصالح کے بموجب منظور فرمالیا۔ لیکن ہندوستان کی سیاسی حالت اور سیاسی خدمات کا جذبہ جو آپکے رگ وپے میں نفوذ کر گیا ہے اس نے اجازت نہ دی کہ کہ عام مدرسین کی طرح آپ ملازمت اختیار کرلیں۔ بلکہ اہتمام کے سامنے اپنے سیاسی مذاق اور سیاسیات ہند کی اہمیت کو صفائی سے پیش کرتے ہوئے کچھ شرطیں لگالیں جن کا مفاد یہ ہے کہ

(۱) سیاسی خدمات میں آپ آزاد سمجھے جائیں گے۔

(۲) سیاسی امور میں مدرسہ کی جانب سے آپ پر کوئی رکاوٹ نہ عائد کیجائیگی۔

(۳) ہر مہینہ میں ایک ہفتہ آپکو اختیار ہوگا کہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے دیوبند سے باہر دوسرے مقامات پر سفر کر سکیں۔ جس کے لئے کسی رخصت یا اطلاع کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس سے زائد پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

اور پھر آپ کا کمال تقوی ہے کہ جب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی وفات ہوئی۔ اور فریضہ اہتمام مولانا محمد طیب صاحب (موجودہ مہتمم) کے سپرد ہوا۔ تو آپ نے ارکان شوریٰ سے اُن شرائط کی دوبارہ تجدید کرائی۔

اس وقت حضرت شیخ کی خدمات ملیہ اہل ہند سے پوشیدہ نہیں۔ جو انجمن۔ جمعیۃ کانفرنس۔ بھی مسلم مفاد کی خاطر ہندوستان میں بنائی جاتی ہے۔ محض اس اضطراب اور جذبہ کے بموجب کہ مسلمانوں کو کسی طرح فائدہ پہنچے ان کی حالت کسی طرح روباصلاح ہو۔ آپ اُس میں شرکت فرماتے ہیں اور درحقیقت سیاسیات ہند کی آپ بہترین روح ہیں۔

---

ممکن۔ سیاسی۔ تبلیغی۔ تدریسی۔ تینوں قسم کی خدمات اور مزید براں دارالعلوم دیوبند کی صدارت کے منصبی) فرائض۔ یعنی خصوصی مشورے۔ نگرانی۔ چندہ کی مساعی۔ مالیات کی اصلاح وغیرہ وغیرہ۔ بیک وقت ادا کرنا۔ درحقیقت حضرت محترم ہی کا ظرف اور آپ ہی کی ہمت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ راحت و آرام۔ بیفکری۔ اور سکون سب کچھ قربان ہو گیا۔ شب و روز کی ایک مسلسل جد و جہد ہے جسکو وہ انسان انجام دے رہا ہے جسکو خدا نے فوق العادت روحانی قوت عطا فرمائی ہے۔

شب کو کئی گھنٹہ مسلسل تقریر۔ اس کے بعد سفر اور پھر صبح مدرسہ میں پہنچکر مسلسل کئی گھنٹہ تک ڈھائی سو طلبہ کی جماعت کو درس جن میں ہر قابلیت اور ہر مذاق کے طلبہ موجود ہوں۔ جن میں بعض وہ بھی ہوں جو کئی سال مدرسی کر کے محض سماعت حدیث کے لئے حاضر ہوئے ہوں۔ پھر وہ دماغ سوز مشقت جو ڈھائی سو تین سو طلبہ کے وسیع حلقہ میں تقریر کرتے ہوئے پیدا ہو۔ پھر اسی طرح ظہر بعد۔ عصر بعد۔ بسا اوقات عشا بعد۔ برابر درس۔

اور پھر ایک دو دن نہیں ہمیشہ۔ مسلسل اور نہ صرف دن کو بلکہ شب کو بھی اسی طرح مشاغل کا تسلسل۔ مثلاً قیام دیوبند کے زمانہ میں مغرب بعد صلوٰۃ اوابین جن میں کم از کم سوا پارہ یومیہ کی تلاوت۔ پھر مسترشدین کو تلقین۔ یا بیعت۔ پھر عشا بعد کتب بینی۔ اخبارات دیکھنا۔ اُن سے یادداشتیں مرتب کرنا (جن کا بیش بہا ذخیرہ ہزارہا صفحات کا اس وقت حضرت موصوف کے پاس موجود ہے) پھر آخر شب میں تہجد۔ اس کے بعد ذکر و مراقبہ وغیرہ وغیرہ

غور فرمائیے۔ کیا کوئی ہے جو اس طرح مسلسل اپنے آپ کو قربان کرتا رہے۔

ہم جیسے آرام طلب مولوی اپنی تن آسانی کو چھپانے کے لئے حضرت شیخ پر اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ لیکن جبکہ حضرت شیخ کے آغاز درس یعنی ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۵۹ھ تک یعنی، صرف بارہ سال کے عرصہ میں دورہ حدیث کے داخلہ کی تعداد سہ چند[1] کے قریب ہوگئی ہو۔ اور پھر نہ صرف طلبہ دورہ حدیث بلکہ دارالعلوم کے کل طلبہ کم از کم ۹۵ فیصدی حضرت شیخ کے گرویدہ اور جان نثار بنکر واپس ہوتے ہوں۔

تو کیا کوئی انصاف پسند جو رشک و حسد کے بدترین مرض سے محفوظ ہو۔ اس قسم کے اعتراضات کی طرف التفات کرسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اختتام سال پر کتاب کے ختم ہونے میں دشواریاں ہوتی ہیں زمانہ امتحان میں بھی بخاری شریف ہوتی رہتی ہے۔ مگر کیا حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے زمانہ میں ایسا نہ ہوتا تھا۔ ؟

حقیقت یہ ہے کہ دورہ حدیث میں بہت سے وہ حضرات شرکت کرتے ہیں جو بار بار کتب حدیث پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ اور اب ان کا مقصود تشفی اور اطمینان حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ کے سوالات بسا اوقات اسباق میں تاخیر پیدا کر دیتے ہیں اور بالخصوص حضرت شیخ مدظلہ العالی کے اخلاق اس درجہ وسیع ہیں کہ کسی طالب علم کے کسی سوال پر کسی وقت بھی آپ چیں بجبیں نہیں ہوتے۔

اس طرح ایک ایک مسئلہ میں پوری جماعت کی طرف سے بسا اوقات دسیوں سوالات ہوتے ہیں۔

---

[1] حضرت علامہ استاذ مولانا انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے آخری دور میں زیادہ سے زیادہ شرکاء دورہ حدیث کی تعداد ۹۰ (نوے) رہی ہے اور حضرت شیخ مدظلہ العالی کے زمانہ میں اسی جماعت کے طلبہ کی تعداد ڈھائی سو کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور کل طلبہ کی تعداد تقریبا سولہ سو رہتی ہے۔ اللھم زدد بارک

**سالانہ چلہ** تقریباً دس ماہ تدریسی اور تبلیغی مشاغل میں اُس پروگرام کے ساتھ گذرتے ہیں۔ جو اوپر بیان ہوا۔ لیکن رمضان مبارک کا مبارک مہینہ عجیب شان سے گذرتا ہے۔

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز اور آپکے خلفاء صوبہ بنگال کی اصلاح کی طرف خاص طور سے متوجہ رہے۔

شیخ الہند ثانی حضرت مولانا حسین احمد صاحب جو اپنے اکابر کے صحیح جانشین ہیں وہ بنگال کو اپنی توجہات کا مرکز کیسے نہ بناتے۔

قیام سلہٹ نے قدرتی طور پر مسلمانان بنگال بالخصوص مسلمانان آسام کا تعلق حضرت شیخ سے وابستہ کردیا۔ اب اہل سلہٹ کچھ ایسے عاشق ہوگئے ہیں کہ رمضان المبارک کا مبارک مہینہ اُنہوں نے اپنے لئے مخصوص کرالیا ہے۔

تمام سال وہ تمناؤں اور مرادوں میں گذارتے ہیں۔ اور جیسے ہی شعبان المعظم شروع ہوتاہے۔ دعوتی خطوط اور تار پہنچنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ شبہہ ہو جاتا ہے۔ تو سلہٹ سے وفود حاضر ہونے لگتے ہیں۔

بہرحال ۲۷، ۲۸ شعبان تک حضرت شیخ دیوبند سے روانہ ہو کر سلہٹ پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچکر آپ کے مشاغل حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

پورے بنگال سے خاص خاص متوسلین سلہٹ پہنچنے لگتے ہیں کچھ قیام کرتے ہیں اور کچھ زیارت کرکے اور دو چار روز حاضر خدمت رہکر واپس ہو جاتے ہیں۔ اوسطاً چار سو حضرات کا مجمعہ ہر روز رہتا ہے۔ جس کے افطار و طعام وغیرہ کا تکفل سلہٹ کے چند اہل ہمت حضرات کرتے ہیں۔

حضرت موصوف مختصر سے افطار کے بعد نماز مغرب سے فارغ ہو کر صلوۃ الاوابین

میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس وقت ایک ڈیڑھ پارہ کی تلاوت ہوتی ہے۔ پھر تراویح میں چارسو پانسو آدمی شریک ہوتے ہیں۔ قرآن شریف حضرت شیخ خود سناتے ہیں۔ مسجد میں تراویح سے فراغت کے بعد ایک اور قرآن نوافل میں ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر آرام فرماکر تہجد شروع کرتے ہیں۔ جس میں سلسلہ دار قرآن شریف ختم کرتے ہیں۔

تہجد کے بعد ذکر و تلقین کا مشغلہ صبح صادق سے تقریباً نصف گھنٹہ تک جاری رہتا ہے۔ نماز صبح سے فراغت پاکر کچھ آرام فرماتے ہیں۔ تقریباً ۸ بجے سے زائرین سے ملاقات اور مجمعہ زائرین میں وعظ و پند کا سلسلہ شروع رہتا ہے۔

باشندگان سلہٹ و مضافات سلہٹ اپنے مکانات پر بھی مجالس وعظ منعقد کرتے ہیں۔ قیامگاہ کی مجلس وعظ کے بعد ان مجالس میں شرکت فرماتے ہیں۔ پھر دوپہر کو خفیف سا قیلولہ فرماتے ہیں۔ نماز ظہر کے بعد قرآن شریف سننے اور سنانے کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ بعد عصر مغرب تک تذکیر و تلقین میں صرف ہوتا ہے۔

اس طرح دن اور رات میں نو نو۔ اور دس دس قرآن شریف کا سلسلہ چلتا رہتا ہے مجالس وعظ وغیرہ اس کے علاوہ۔

نماز عید سے فراغت پاکر واپسی ہوتی ہے۔ بنگال سے دیوبند تک متوسلین اور مشتاقوں کے تقاضوں کے بموجب موقعہ بموقعہ قیام فرماتے ہوئے۔ یعنی گویا تبلیغی دورہ فرماتے ہوئے آخر شوال تک حضرت والا دیوبند پہنچتے ہیں۔ پھر اگر حج بیت اللہ شریف کا عزم بھی ہو تو یہ مسلسل سفر متواتر چار ماہ باقی رہتا ہے۔ جس میں آرام اور راحت کا نام نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا ہے کہ حجاز پہنچکر بھی زائرین کی کثرت آرام کا موقعہ نہیں دیتی۔ غالبًا ۱۳۴۲ھ میں جب آپ حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ تو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ایم۔ایل۔اے مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد بھی ہمراہ تھے۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اس زمانہ میں مکہ معظمہ میں قیام فرما تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی خواہش رہی کہ حضرت شیخ سے ایک گھنٹہ تخلیہ کا موقعہ مل جائے۔ مگر ممکن نہ ہوسکا۔

**جود و سخا** استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت شیخ کی طبیعت شاہانہ واقع ہوئی ہے۔ یعنی پیسہ کی کبھی پرواہ نہیں ہوتی۔ دسترخوان اتنا وسیع ہے کہ عمومًا چھ سات مہمان ہمیشہ رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات اُن کی تعداد اس سے زائد ہوتی ہے۔

## سیاسی ماحول اور خدمات

حضرت محترم کا ابتدائی زمانہ حضرت شیخ الہند اول مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی رفاقت میں گذرا۔ لہٰذا اس زمانہ کا سیاسی ماحول بھی وہی تھا جو پہلے گذر چکا۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ چونکہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب اسارت مالٹا سے پیشتر تقریبًا ۱۲ سال خاص مدینہ طیبہ میں اقامت گزیں رہے تو آپ سیدنا شیخ الہند کی تحریک کے وہ مخصوص اور اہم رکن تھے جو مدینہ طیبہ میں رہ کر خدمات انجام دے رہے تھے۔ حضرت شیخ مدظلہ العالی اس کے لئے قطعًا آمادہ نہیں کہ اُن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائے۔ اسلئے اس زمانہ کی خدمات تفصیل سے بیان نہیں کی جاسکتیں۔

مگر اتنی چیز واضح ہے کہ کرنل لارنس کی زہر آلود تحریک سے مدینہ طیبہ قطعاً محفوظ رہا۔
باشندگانِ مدینہ طیبہ آخر تک ترکوں کے وفادار رہے۔ اور انہوں نے کرنل لارنس۔ یا
میکموہن کی دلفریب تحریک کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

اسی بنا پر اہل مدینہ پر غلہ بند کر دیا گیا۔ ترکی فوج اور افسروں نے انتہائی جدو
جہد کی۔ کہ ان کے لئے رزق کے دروازے کھل جائیں۔ مگر یورپ کے سفید فام درندے
رحم کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔ حتیٰ کہ بقول حضرت مولانا حسین احمد صاحب حرم رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں مجاور۔ بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرتے
ہوئے واصل بحق ہوئے۔ بہت سے وہ بھی تھے جو شدت گرسنگی میں مردوں کا گوشت
کھانے پر مجبور ہوئے اور طرح طرح کی لرزہ خیز مصیبتیں برداشت کیں۔

بہر حال حضرت شیخ مدظلہٗ العالی۔ انقلاب حجاز کے بعد گرفتار کئے گئے۔ مالٹا
بھیجے گئے۔ وہاں سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے۔ یہ تمام تفصیل حضرت شیخ الہند اول
کے حالات کے سلسلہ میں گذر چکی

اس کے بعد تشریف آوری ہندوستان کے زمانہ میں جو سیاسی ماحول تھا
وہ بھی گذر چکا۔

اس کے بعد حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند ثانی مولانا سید حسین احمد
صاحب نے کوئی نیا پروگرام قوم کے سامنے پیش نہیں فرمایا۔ بلکہ اسی پروگرام پر
عمل پیرا ہیں جو حضرت شیخ الہند اول مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز
ترتیب دے چکے تھے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے زمانہ میں

چونکہ اُس پر عمل زیادہ عرصہ تک نہیں ہو سکا۔ لہذا اس کی تفصیلات بھی حضرت موصوف کے سامنے نہیں آئیں۔

حضرت شیخ الہند ثانی مولانا سید حسین احمد صاحب کو (جانشین شیخ الہند اور مسلم حلقہ میں تحریک کا قائد اعظم ہونے کی حیثیت سے) اس کی تفصیلات پیش کرنی پڑیں۔ اور پیش فرما رہے ہیں۔ اور اس تفصیل کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ اس ماحول کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے پیش کریں۔

---

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ جنگ جرمنی کے بعد جب برطانیہ اور اس کے حلفاء کو فتح نصیب ہوئی تو دنیا کی سیاست کا نقشہ بالکل بدل گیا۔

اہل سیاست پوری طرح واقف ہیں کہ ذرائع آمد و رفت کی وسعت اور سہولت نے اب تمام دنیا کو ایک ملک کی حیثیت دیدی ہے۔ مشرق اور مغرب کے بعید ملکوں کی ڈانڈی ایک دوسرے سے اس طرح ملادی ہے کہ دنیا کی کسی ایک حکومت کا انقلاب تمام دنیا کی سیاست کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

مصارف جنگ کی بے پناہ زیادتی نے حکومتوں کا مالک (انہیں) جماعتوں کو بنا دیا ہے۔ جو ملوں اور مشینوں کی مالک ہیں۔ اور لاتعداد دولتوں کے خزانے ان کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

ہندوستان جیسے براعظم میں کسی دوسری حکومت کے ذریعہ سے انقلاب پیدا کیا جائے۔ تو ہندوستان کو کیا فائدہ (ہم آزادی کے دلدادہ ہیں۔ آقا کی تبدیلی ہم نہیں چاہتے۔ اور اگر اسلامی اخوت کے نکتہ نظر سے ہم اسکے خواہاں ہوں

توافغانستان اور ایران یا دور حاضر کے تمام اسلامی ممالک بھی اگر مل جائیں۔ تو کیا برطانیہ اور اُس کے حلفا سے کامیاب جنگ کر سکتے ہیں۔؟

---

جدید آلات جنگ کی خونخواری اس درجہ لرزہ خیز ہے کہ برطانیہ اور فرانس جیسی دنیا کی سب سے بڑی حکومتیں جرمن اور اٹلی کے مطالبات کے سامنے سر جھکاتی جا رہی ہیں۔ اور آنے والی جنگ کو اُس کے آخری وقت تک ٹالنے کے درپے ہیں۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ مذہب کے نام پر جنگ کا اب خاتمہ ہو گیا ہے۔ دنیا نے تباہی حبشہ کی داستان سنی حالانکہ فاتح اور مفتوح دونوں کا مذہب ایک ہے۔

اسپین کی خونریز جنگ کا تماشا دنیا نے دیکھا جس میں بھائی نے بھائی کو باپ نے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا — ؟ — کیا مذہبوں میں تبدیلی ہو گئی تھی؟ آج جاپان۔ چین کو ہڑپ کر رہا ہے۔ اس کے زرخیز خطوں کو گولے اور بارود کے کرشموں سے آتشیں جہنم بنا رہا ہے۔ لاکھوں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپا رہا ہے۔ حالانکہ مذہب ایک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب نہ کبھی قتل و خون کا سبب۔ نہ اب سبب ہے۔ اغراض پرستوں کی خود غرضی نے ہمیشہ انسانی خون کے ساتھ ہولی کھیلی۔ اور وہی اب بھی پشت زمین کو ظلم و ستم کا لالہ زار بنائے ہوئے ہے۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ ظلم و ستم کی فراوانی نے مظلوموں کو موت پر آمادہ کیا۔ وہ قتل کئے گئے۔ تباہ اور برباد کئے گئے۔ آخر کار ظالم کا ظلم خود اُس کے گلے پڑا۔ چنانچہ کبھی اس کو دریا نیل میں غرق کر دیا گیا۔ اور کبھی غزوہ بدر میں شکست دیکر مظلوموں کو فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی گئی۔ اور پھر انکو ہدایت کی گئی کہ ملک ابوجہل اور ابولہب یا قیصر و کسریٰ کا نہیں۔ ملک خدا کا ہے۔ تم آگے بڑھو اور خدا کے

ملک کو ظلم سے پاک کرو۔ خدا کی مخلوق کو مظلومیت سے نجات دلاؤ۔

تم ہی بتاؤ۔ جنگجو۔ رحمۃ للعالمین تھے (صلے اللہ علیہ وسلم) یا ابوجہل اور ابولہب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو غرقابی کے لئے دعوت دی تھی۔ یا وہ خود بنی اسرائیل کے تعاقب کے لئے نکلا تھا۔؟

بہرحال آج بھی دنیا کے سامنے یہی نقشہ ہے۔ برق اور اسٹیم نے دنیا کے غریبوں کو بے روزگار بنا دیا ہے۔ اور ساری دولت سرمایہ داروں اور مالکان مل کے خزانوں میں بھر دی ہے۔ اب اصل سوال۔ بھوک اور فاقہ مستی کا ہے۔ یہاں مذہب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ سرمایہ دار مذہب کی آڑ لیکر بھوکوں کی ٹکر سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس سے سرمایہ داروں کو نجات تو کیا ملتی۔ ہاں یہ نقصان مزید پیدا ہو جاتا ہے کہ بھوکے جب معاندی مذہب کو ظالم کے ساتھ دیکھتے ہیں تو وہ مذہب سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

زار روس کا آخری کارنامہ یہی ہے کہ اس نے مذہب کے نادان اور لالچی پیشواؤں کا ایمان خریدا۔ ان کو غریبوں اور مزدوروں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بے دینی اور لامذہبی بالشوزم کا جزو اعظم بن گئی۔

لہٰذا آج ہر ایک مدبر اور ہوشمند کا انسانی اور اسلامی فرض ہے کہ وہ غلط اور خام خیالات کے ذریعہ سے انقلاب کے پریشان خواب دیکھنے کے بجائے خود کو اور اپنی مذہبی حمیت وغیرت کو مدبرانہ تحریک کا جز بنا دے۔

لیکن اس کے لئے سب سے اہم یہ تھا کہ مسلمانوں میں اپنی غربت۔ افلاس فاقہ مستی کا احساس پیدا ہوا۔ ان کی اقتصادی حالت کیا تھی۔ پھر ان کو کس طرح

کنگال کر دیا۔ اُن کی صنعت و حرفت کو کس طرح تباہ کیا۔ ان تمام چیزوں کا شعور پیدا ہو اور پھر جس طرح اقتصادیات کے متعلق احساس و شعور کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ ہندوستانی ہونے کا احساس اور حب وطن کا جذبہ بھی ان میں پیدا ہو۔ تاکہ وہ غیر ملکی مفاد کی خاطر۔ اپنے ملک اور خود اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو تباہ و برباد کرنے کے پرانے مرض سے نجات پائیں۔

کاش ہمارے سامنے گزشتہ دو سو برس کی تاریخ ہو۔ تو ہم سمجھ سکیں کہ ہم نے اس احساس کے نہ ہونے کے باعث کس طرح خود کو تباہ کیا۔ کس طرح اپنی سلطنت برباد کی۔ اور پھر کس طرح دنیا کی دوسری آزاد قوموں کو۔ اور آہ۔ مسلم اقوام کو۔ اور آہ ثم آہ خاص حجاز مقدس اور حرم اقدس کے رہنے والوں کو برباد کیا۔ بھوکا بنایا اور تباہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ علماء مذہب کا کام تبلیغ ہے۔ درس و تبلیغ ان کا مشغلہ ہونا چاہئے۔ آٹا۔ اناج۔ سوت۔ کپاس کے نرخ سے اُن کو کیا واسطہ؟

مگر خدارا بتائیے کہ ہندوستان کے یہی غیور مسلمان۔ جو علماء ملت پر ہندو پرستی کا الزام لگاتے ہیں گزشتہ جنگ جرمنی کے زمانہ میں انہوں نے عراق۔ شام۔ ایران وغیرہ وغیرہ اسلامی ممالک کو انگریز کے لئے کیوں تباہ کیا۔ خاص قبلہ ایمان۔ اور کعبہ اسلام پر کیوں گولیاں برسائیں۔

اس کا سبب بھوک اور فاقہ۔ بے روزگاری اور تہیدستی تھی۔ ایمان کے دیوں میں اسلام اور ایمان سے مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ سے۔ عربوں یا ترکوں سے کوئی بغض بھرا ہوا تھا۔

---

انگریز نے عربوں کو ترکوں سے باغی بنایا۔ ان کا سبق یہ تھا کہ آج قومیں مذہب سے نہیں بنتیں۔ آج قومیں اقتصادی اور سیاسی مصالح کے پیش نظر ترتیب دی جاتی ہیں ـــــ لہٰذا ترک جدا قوم ہے۔ اور عرب علیحدہ قوم۔ عربوں کے لئے ترکوں کی غلامی عار ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سبق تھا جس کے ذریعہ سے عربوں کو باغی بنا کر نہ صرف ترکوں بلکہ تمام اسلامی ممالک کو برباد کیا۔

ہم اس کے قائل نہیں کہ قومیت صرف سیاسی اور اقتصادی اصول پر ترتیب دی جاتی ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی اگر عربوں کو ترکوں سے جدا ایک دوسری قوم قرار دیتی ہے۔ تو کیا ہندوستانیوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ اقتصادی اور سیاسی اصول پر ہندوستانیوں کو انگریزوں سے جدا ایک مستقل قوم قرار دیں۔

یہی وہ قومیت متحدہ ہے جو انگریز کی نظر میں سب سے زیادہ مہلک مرض ہے۔ ۱۹۳۷ء میں سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے دہلی کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہی حقیقت واضح کر دی تھی۔ اب کیا تھا۔ انگریز کو اختلاج ہو گیا ـــــ انگریز پرست شعرا کی زبانیں دراز ہونے لگیں۔ اور قومیت متحدہ کے برخلاف نہ صرف یہ کہ ایک دو تقریر کی گئی۔ یا کوئی مضمون نکالا گیا مستقل ادارے قائم کر دیئے گئے جو ہندوستانیوں سے قومیت متحدہ[ع] کے تخیل کو دور کریں۔

---

ع قومیت متحدہ کے متعلق مفصل بحث حضرت شیخ مدظلہ العالی کے رسالہ "قومیت متحدہ اور اسلام" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں نظریہ کی توضیح کے لیے چند سطور درج کی جاتی ہیں: "ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں۔ اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۲۶۰ پر)

یہ ہے ظالموں کی وہ چیرہ دستی جس کے مقابلہ پر خدا کے برگزیدہ رسول گڑگڑا کر کہتے رہے ہیں۔ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔

ایک طویل تحریر کے بعد ہم پر اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے پروگرام کے لئے جزو اعظم دو چیزیں تھیں۔ اقتصادی تباہ حالی کا احساس قومیت مشترکہ کا احساس۔ کیونکہ تشدد کے بدون آئینی جنگ صرف اسی صورت میں متصور ہے کہ اقوام ہند کی اکثریت۔ ایک نقطہ نظر پر متفق ہو کر اقتصادی اصول پر جدو جہد کرتے ہوئے اور اقتصادی سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے۔ ہندی قومیت کو نہ صرف ہندوستان تک محدود رکھے۔ بلکہ بیرونی اقوام کی مدافعت اور مقابلہ کے لئے اس کو آلہ کار بنائے۔

سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی اس پروگرام کو آج سے نہیں بلکہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے۔ اور ابھی حضرت موصوف کی وہ تقریریں فراموش نہیں ہوئی ہوں گی۔ جن میں اول سے آخر تک غلوں کے نرخ

---

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۹) سب کو فنا کر رہی ہے۔ جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں۔ اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکالکر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے۔ بلکہ تمام ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات اور مذہبی اعمال میں آزاد ہیں۔ اپنے مذہبی رسم و رواج مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو۔ امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے اپنے پرسنل لا۔ کلچر تہذیب کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو۔ اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرے یہی وہ چیز ہے جسکا اعلان کانگریس ہمیشہ سے کر رہی ہے۔ ۱۲ قومیت ... متحدہ اور اسلام ص ۱۵)

اور ہندوستان کی صنعت پر انگریزوں کے اقوال اور تاریخی حوالجات ہوتے تھے۔

عام مسلمان ان سے دلچسپی نہ لیتے تھے۔ بلکہ ابتداء میں تو یہ صورت تھی کہ دس ہزار کے مجمعہ میں اگر تقریر شروع تو آخر تک مشکل سے پانسو آدمی جلسہ میں باقی رہجاتے تھے۔ مگر حضرت شیخ مدظلہٗ کا یہ استقلال تھا کہ اول سے آخر تک آپ کی تقریر میں کوئی اثر نہ آتا تھا۔ اور گویا

سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم کے اصول پر کار بند ہوتے ہوئے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اقتصادی امور کو ان کے کانوں میں ڈالیں۔ خواہ وہ دس ہزار ہوں یا پانسو۔

لیکن بیس سال کا عرصہ نہیں ہوا۔ کہ بفضلہ تعالیٰ مسلمانوں کے مذاق میں اسقدر تبدیلی ہوگئی۔ کہ آج مسلمانوں کے سیاسی اجتماعات میں کوئی تقریر پسند نہیں کی جاتی۔ جب تک اقتصادی مباحث اس میں نہ ہوں۔ اور غلوں اور کپڑوں کا نرخ ان میں بیان نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ آج مسلم لیگ بھی مجبور ہے کہ وہ اقتصادی پروگرام کا جھنجنا مسلمانوں کو دے۔

اگرچہ ظاہر ہے کہ اگر لیگ کا مقصد واقعی صنعت وحرفت کی ترقی۔ اور مسلمانوں کے فاقہ اور افلاس کو دور کرنا ہوتا۔ تو عرصہ پیشتر سے لیگ کانگریس کا بازو بن چکی ہوتی۔

بہرحال اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کی سعادت حضرت شیخ مدظلہٗ العالی کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کا احساس اب نہیں تو چند سال بعد مسلمانوں کو ہوگا۔ بشرطیکہ کوئی ترقی قدرت نے ان کے لئے ٹے

کررکھی ہے۔؟

مرا از ما نصیحت بود کردیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ و الصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ و افضل رسلہ و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔

خادم خلق اللہ
خاکپائے ورثۂ انبیا
محمد میاں عفی عنہ

مدرس مدرسہ شاہی۔ مراد آباد۔ و ناظم جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ۔ ۷ر شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۸ھ
مطابق ۲۲ر ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء

# خاتمہ کتاب

ہم اپنے اس مجموعہ کو مولانا ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار لاہور کی ایک نظم پر ختم کرتے ہیں جو چند سال پیشتر۔ زمیندار۔ مدینہ وغیرہ اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند
حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دوچند

اسم تیرا بامسمیٰ۔ ضرب تیری بے پناہ
دیو استبداد کی گردن میں تیری ہی کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جان سے نثار
قرن اول کی خبر لائی تری الٹی زقند

تو علم بردار حق ہے حق نگہبان ہے ترا
سیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھکو گزند

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کر لیا ان عالمان دین قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموس محمد پر فدا
حق کے رستے میں کٹا دینگے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جنکے آگے بارہا گنگی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قائم ہوں کہ انور شہ کہ محمود الحسن
سبکے دل تھے دردمند اور سبکی فطرت ارجمند

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جن سے ہے پرچم روایات سلف کا سر بلند

# قطعہ تاریخ

(از جناب مولانا قدرت اللہ صاحب کاتب)

مرحبا کیا خوب ہی تحریر ہے ۔۔۔ طرز جس کا دل نشیں و دلگیر ہے

کی حکومت ہند میں نو سو برس ۔۔۔ کیوں غلامی کی پڑی زنجیر ہے

ہند میں ہیں اور قومیں بھی غلام ۔۔۔ کیوں مسلمانوں ہی کی تحقیر ہے

مالکانِ تاج. کیوں محتاج ہیں؟ ۔۔۔ ان حقائق کی صحیح تفسیر ہے

ہر سطر میں حریت کا ہے سبق ۔۔۔ ہر سبق پُر درد، پُر تاثیر ہے

یعنی جانبازوں کی ہیں قربانیاں ۔۔۔ رزم گہ کی بولتی تصویر ہے

رات کو تسبیح - دن کو ہاتھ میں ۔۔۔ خون میں ڈوبی ہوئی شمشیر ہے

ہند کے عالم، شیوخ و جاں فروش ۔۔۔ ق ۔۔۔ جن کی خاکِ رہ بھی اکسیر ہے

جنگ بالاکوٹ میں ہیں سر بکف ۔۔۔ اور زباں پر نعرۂ تکبیر ہے

رسمِ تازہ کر گئے حسینؓ کی ۔۔۔ ہاں انھیں کے واسطے تبشیر ہے

مچ گئی ہے دھوم اس تصنیف کی ۔۔۔ ان کی شہرت آج عالمگیر ہے

ماخذ جس کے صحیح و مستند ۔۔۔ مادہ ہر ایک آتشگیر ہے

مصرعہ تاریخ لکھنے کے لئے ۔۔۔ فکر میں کیوں قدرت دلگیر ہے

کہہ دے - ماضی عالمان دین کی

عالی رتبہ عشق کی تصویر ہے

سنہ

۱۹ ۶ ۳۹

تصویر اسلام
تاریخ اسلام
تعلیم اسلام
اگر آپ
اسلام کی کامل اور مکمل تصویر، اسلامی تعلیمات کا مکمل نقشہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ۔ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل کتابوں کا سٹ آج ہی منگا لیجئے۔ جو باتفاق علمار کرام اس مقصد کیلئے بے نظیر ہے اور نہایت ارزاں
(۱) اسلامی تعلیمات کا تبلیغی مرقعہ قیمت ۲ر
یعنی "تصویر اسلام" خوبصورت نقشہ کی شکل میں طبع کرایا گیا ہے (۲) اربعین مصنفہ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث۔ یعنی تصویر اسلام کتابی شکل میں تیار کرائی گئی ہے قیمت ۶ر
(۳) تاریخ اسلام
مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب استاذ الادب جامعہ قاسمیہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سیرت سوال و جواب کی شکل میں
قیمت حصہ اول ۶ر حصہ دوم ۱۲ر - حصہ سوم ۶ر
(۴) اسلامی تاریخ کی پہلی کتاب
عرف "ہمارے پیغمبر" مع عقائد و احکام اسلام۔ از مولانا سید محمد میاں صاحب یہ مختصر کتاب اپنی خوبیوں میں بے نظیر ہے۔ قیمت صرف ۳ر (سارھے تین آنے)
نصیحۃ الشیعہ۔ یہ کتاب شیعہ مذہب کی تحقیق اور شیعہ اعتراضات کے تحقیقی اور الزامی جوابات کے متعلق مستند اور بہتر ذخیرہ تسلیم کیگئی ہے عرصہ سے نایاب تھی جناب مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے طبع کرایا ہے۔ قیمت ہر سہ حصہ مکمل عہ (دو روپے)
یہ کتابیں اور ہر قسم کی کتابیں کتبخانہ فخریہ امروہیہ گیٹ مراد آباد سے طلب کیجئے